مسلمان عورت کے حقوق

اور ان پر

اعتراضات کا جائزہ

سید جلال الدین عمری

نذرانۂ عقیدت

ان اوراق کو میں بصد ادب و احترام اپنی والدہ ماجدہ محترمہ زینب بی صاحبہ کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتا ہوں، جن کے قدموں کے نیچے میری جنت ہے اور جن کی دعائیں اور نیک تمنائیں زندگی بھر میرے ساتھ رہیں، امید ہے آئندہ بھی وہ سرمایۂ حیات بنی رہیں گی۔

اللہ تعالیٰ تادیر ان کا سایہ سلامت رکھے۔ آمین*

خادم

جلال الدین

۴ر مارچ ۱۹۸۶ء

* افسوس کہ ۱۸ر جون ۱۹۹۱ء کو والدہ ماجدہ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ اور وہ اللہ تعالیٰ کی جوارِ رحمت میں پہنچ گئیں۔

جلال الدین

۲۴/ فروری ۲۰۰۴ء

فہرست مضامین

اعتراضات کا جائزہ ۴۴

طبع ہشتم

یہ کتاب 'مسلمان عورت کے حقوق اور ان پر اعتراضات کا جائزہ' ہے، جو وقت کے ایک اہم اور زندہ موضوع سے بحث کرتی ہے۔ اس کے تین ایڈیشن کافی پہلے 'ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی' علی گڑھ کی طرف سے نکل چکے ہیں۔ ۲۰۰۴ء سے یہ مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی-۲۵ سے شائع ہو رہی ہے۔ پاکستان سے بھی اس کی اشاعت عمل میں آئی ہے۔ ایک پاکستانی رسالے نے اسے خصوصی شمارے کے طور پر شائع کیا ہے۔ اس کا ایک باب 'نفقہ مطلقہ' کتابچے کی شکل میں کافی پہلے طبع ہو چکا ہے۔ اس کا انگریزی ترجمہ Maintenance of The Divorcee بھی شائع ہوگیا ہے۔ خوشی ہے کہ کتاب کے مواد کو بعض حضرات نے اپنے مضامین اور مقالات میں استعمال کیا ہے۔ اس کے انگریزی ترجمہ Rights of Muslim Women A Critique of the Objections کے دو ایڈیشن مرکزی مکتبہ کی طرف سے سامنے آچکے ہیں۔ ہندی ترجمہ اشاعت کا منتظر ہے۔

کتاب کے ساتویں بار پریس میں جانے سے پہلے پوری کتاب پر نظرِ ثانی ہوئی ہے۔ کتابت و طباعت کی جو خامیاں رہ گئی تھیں انھیں دور کرنے اور زبان و بیان کے لحاظ سے زیادہ سبک اور رواں بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ بعض مباحث میں اضافے ہوئے ہیں، جن سے توقع ہے کہ اسلام کے موقف کی بہتر وضاحت ہو سکے گی۔ جہاں کہیں ضرورت محسوس ہوئی حوالے فراہم کیے گئے ہیں۔ اب اس کا آٹھواں ایڈیشن مرکزی مکتبہ اسلامی پیش کر رہا ہے۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ ان کوششوں کو شرفِ قبولیت سے نوازے اور کوتاہیوں سے درگزر فرمائے۔

جلال الدین عمری

۱۷؍اپریل ۲۰۱۷ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

جن اسلامی موضوعات پر ادھر ایک عرصہ سے علمی حلقوں میں بحث و مباحثہ جاری ہے، ان میں عورت کے حقوق کا موضوع متعدد پہلوؤں سے بڑی اہمیت اختیار کرچکا ہے۔ اس پر جدید ذہن کو کئی ایک شدید اعتراضات ہیں۔ اس کتاب میں پہلے مختصر طور پر وہ حقوق بیان کیے گئے ہیں جو اسلام نے عورت کو دیے ہیں۔ اس کے بعد ان نمایاں اعتراضات کا تفصیل سے جائزہ لیا گیا ہے جو اس موضوع پر کیے جاتے ہیں۔ اس میں جن مسائل سے بحث کی گئی ہے ان کے تمام اطراف و جوانب کا احاطہ نہیں کیا گیا ہے بلکہ اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ بحث کا دائرہ اعتراضات کے جواب تک محدود ہو اور اس سلسلہ میں جو الجھنیں پائی جاتی ہیں وہ رفع ہوجائیں۔ ان میں سے بعض مسائل پر میں اپنی دوسری تحریروں میں تفصیل سے بحث کرچکا ہوں، یہاں ان پر اختصار کے ساتھ گفتگو کی ہے۔[1]

کتاب میں کسی بھی مسئلہ میں بحث کا انداز نہ تو مناظرانہ ہے، جس میں سمجھنے سمجھانے کا جذبہ ناپید ہوتا ہے اور نہ تاثراتی ہے، جس میں آدمی کے اپنے جذبات و احساسات آگے

---

[1] اسلامی معاشرت پر پیش نظر کتاب کے علاوہ میری حسب ذیل کتابیں اور رسالے شائع ہوچکے ہیں:
(۱) عورت ــــ اسلامی معاشرہ میں (۲) عورت اور اسلام (۳) اسلام کا عائلی نظام (۴) مسلمان خواتین کی ذمہ داریاں (۵) قرآن کا نظامِ خاندان (۶) بچے اور اسلام (۷) خاندان کی اصلاح اور اولاد کی تربیت۔ دو ضخیم کتابیں زیر ترتیب ہیں۔
(۱) خاندان۔ اسلامی تعلیمات میں (۲) والدین کے حقوق اور فرائض۔ ان کتابوں کے مختلف مباحث ماہنامہ زندگی رام پور، الفرقان لکھنؤ اور برہان دہلی میں شائع ہوچکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی تکمیل کی توفیق عطا فرمائے۔

آگے چلتے ہیں اور علمی تجزیہ پیچھے رہ جاتا ہے۔ اس کی جگہ خالص علمی انداز میں قرآن، حدیث اور فقہ کی روشنی میں جوابات دیے گئے ہیں اور کوئی بات بلا حوالہ اور بغیر سند کے نہیں کہی گئی ہے۔ حوالوں کو خواہ مخواہ طویل کرنے سے احتراز کیا گیا ہے۔ موقع پر بالعموم صرف کتاب کا حوالہ دیا گیا ہے۔ مصنف، مطبع، ایڈیشن وغیرہ کی تفصیل کتاب کے آخر میں دے دی گئی ہے۔

مسلمان عورت کے حقوق پر اعتراضات چوں کہ مغرب کے زیر اثر کیے جاتے ہیں، اس لیے شروع ہی میں آزادیِ نسواں کے مغربی تصوّر کا تھوڑا سا جائزہ بھی لیا گیا ہے۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ اپنی ظاہری چمک دمک کے باوجود اس کے تاریک پہلو بھی ہیں۔ یہ ہمارے لیے قابلِ تقلید نہیں ہے۔

اس موضوع پر تنقید و اعتراض کا سلسلہ غالباً اس گروہ کی طرف سے شروع ہوا جس کی اسلام سے دشمنی اور مخالفت مشہور و معروف تھی، لیکن اب بدقسمتی سے بہت سے مسلمان دانشور بھی اس میں شریک ہوگئے ہیں۔ یہ دانش ور حضرات اپنے حلقوں میں کتنے ہی قابل اور محقق سمجھے جاتے ہوں اور ان کو عزت و احترام کا جو بھی مقام حاصل ہو ان کی تعداد مسلمانوں میں برائے نام ہے۔ کتاب میں ان ہی لوگوں کا جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے، لیکن اس وقت عام مسلمانوں سے بھی، جن میں کا ایک فرد خود لکھنے والا بھی ہے اور جو ان میں پائی جانے والی کم زوریوں سے پاک نہیں ہے، کچھ عرض کرنے کو جی چاہتا ہے۔

عام مسلمان اپنے اس یقین اور ایمان کا زبان سے تو اظہار کرتے ہیں کہ اسلام نے عورت کو جو حقوق دیے ہیں وہ خدائے تعالیٰ کے دیے ہوئے ہیں۔ یہ حقوق لازماً ادا ہونے چاہئیں۔ ان میں ترمیم و تنسیخ کو وہ اللہ تعالیٰ کے قانون میں بہ راہِ راست مداخلت تصور کرتے ہیں اور اسے روکنے اور اس قانون کو صحیح شکل میں باقی رکھنے کے لیے ہر طرح کی قربانی دینے کے لیے بھی تیار نظر آتے ہیں، لیکن عملاً وہ ان احکام کے پوری

طرح پابند نہیں ہیں بلکہ قدم قدم پر اس کی خلاف ورزی ان سے ہوتی رہتی ہے۔ باپ بیٹی کے حقوق نہیں ادا کرتا، اس کی تعلیم و تربیت کی طرف اتنی توجہ نہیں دی جاتی جتنی توجہ کہ لڑکوں کی تعلیم کی طرف دی جاتی ہے۔ لین دین میں دونوں میں فرق کیا جاتا ہے، مختلف بہانوں سے وہ حق وراثت سے محروم رکھی جاتی ہے۔ ماں اور باپ کے ساتھ اولاد کا رویہ خاص طور پر شادی اور اپنا گھر بسانے کے بعد بہت غلط ہوتا ہے، ان کے ساتھ حسنِ سلوک نہیں ہوتا، ان کے قانونی حقوق ادا نہیں کیے جاتے، ان کے پاس اگر کوئی ذریعۂ معاش نہ ہو تو وہ عسرت کی زندگی گزارنے پر مجبور ہوجاتے ہیں، بیوی کو شوہر کی محبت نہیں ملتی، سسرال میں اس کے ساتھ ملازمہ کی طرح سلوک ہوتا ہے، وہ اپنے بہت سے حقوق سے محروم رہتی ہے، بات بات پر سختی شروع ہوجاتی ہے، معمولی سے اختلافات طلاق کا بہانہ بن جاتے ہیں، مہر کے بارے میں یہ تصور ہے کہ وہ طلاق کی صورت میں دیا جاتا ہے، طلاق نہ ہو تو اس کے ادا کرنے کی کوئی کوشش نہیں ہوتی۔ یہی رویہ بالعموم ان تمام عورتوں کے ساتھ اختیار کیا جاتا ہے جن کے حقوق اسلام نے مرد پر عائد کر رکھے ہین اور جن کے ساتھ حسن سلوک کی تعلیم دی ہے۔ اسلام نے (اپنے حدود کے اندر) عورت کو معاشی جدوجہد کی اجازت دی ہے، وہ اسے تعلیم میں آگے بڑھانا چاہتا ہے؛ اسے دعوت و تبلیغ، نشر و اشاعت، تنقید و احتساب اور سیاسی و سماجی خدمات کا حق ہے؛ لیکن عملاً ان میں سے کسی میدان میں اس کا وجود نہیں ہے۔ پھر دنیا کیسے یقین کرسکتی ہے کہ اسلام نے اسے ترقی کے تمام مواقع فراہم کیے ہیں اور اسے وہ سب کچھ دیا ہے جو اسے ملنا چاہیے؟

اسلام نے عورت کو جو حقوق دیے ہیں مسلم معاشرے میں اگر ان کا احترام پیدا ہوجائے اور وہ ٹھیک ادا کیے جانے لگیں تو وہ مسائل ہی شاید پیدا نہ ہوں جن کا حوالہ دے کر پورے اسلامی قانون ہی کو بدنام کرنے اور اسے بدلنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اگر مسلمان خود ہی عورت کے حقوق ادا نہ کریں تو وہ کس منہ سے دوسروں

سے کہہ سکتے ہیں کہ یہ حقوق ان کے لیے پوری طرح واجب الاحترام ہیں، اس میں کسی قسم کی تبدیلی کو وہ گوارہ نہیں کر سکتے۔ ان کی بے عملی خود اس بات کی دلیل بن جائے گی کہ اس کی تقدیس ختم ہو چکی ہے اور اس کی کم از کم عملی اہمیت باقی نہیں رہی ہے۔

یہ بات اچھی طرح ذہن میں رہنی چاہیے کہ اسلام نے عورت کو جو حقوق دیے ہیں وہ اگر خوش دلی سے ادا نہ کیے جائیں تو ان کے حصول کے لیے وہ غیر اسلامی قوانین کا سہارا لے سکتی ہے۔ اس کے اندر یہ احساس بھی ابھر سکتا ہے کہ جس قانون سے اسے کوئی فائدہ نہیں پہنچ رہا ہے اسے تبدیل ہو ہی جانا چاہیے، یہ محض قیاس آرائی نہیں ہے بلکہ واقعات اس کی تائید کر رہے ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ پورا معاشرہ اسلام کی طرف پلٹے اور خلوص کے ساتھ اس کے احکام کا پابند ہو جائے۔

آخر میں عرض ہے کہ یہ ایک حقیر سی دفاعی کوشش ہے۔ اس میں غلطیوں کے بڑے امکانات ہیں، ایسے افراد کی ہم میں کمی نہیں ہے جو اس موضوع پر وسیع اور گہری نظر رکھتے ہیں، وہ اس میں جہاں کہیں کوئی خامی محسوس کریں اس سے آگاہ فرمائیں۔ آئندہ اس کی اصلاح کردی جائے گی اور یہ بے مایہ اس کے لیے بے حد شکر گزار ہوگا۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ یہ کتاب جس مقصد کے لیے لکھی گئی ہے وہ پورا ہو، اس کے بندوں کو اس سے نفع پہنچے اور اس ناکارہ کے لیے ذخیرۂ آخرت ثابت ہو۔

جلال الدین عمری

۲۱ر فروری ۱۹۸۶ء

آزادیٔ نسواں کا مغربی تصور
اور اس کے نتائج

تاریخ کے ایک طویل عرصہ سے عورت مظلوم چلی آ رہی تھی۔ وہ ہر قوم میں اور ہر خطہ میں مظلوم تھی۔ یونان میں، روم میں، مصر میں، عراق میں، ہند میں، چین میں، عرب میں ہر جگہ اس پر ظلم ہو رہا تھا۔ بازاروں اور میلوں میں اس کی خرید وفروخت ہوتی تھی، حیوانوں سے بدتر اس کے ساتھ سلوک کیا جاتا تھا۔ یونان میں عرصہ تک یہ بحث جاری رہی کہ اس کے اندر روح ہے بھی یا نہیں؟ اہلِ عرب اس کے وجود ہی کو موجبِ عار سمجھتے تھے۔ بعض شقی القلب اپنی لڑکیوں کو زندہ در گور کر دیتے تھے۔ ہندوستان میں شوہر کی چتا پر اس کی بیوہ جل کر راکھ ہو جاتی تھی۔ راہبانہ مذاہب اسے معصیت کا سرچشمہ، گناہ کا دروازہ اور مجسّم پاپ سمجھتے تھے۔ اس سے تعلق کو روحانی ترقی کی راہ میں رُکاوٹ تصور کیا جاتا تھا۔ دنیا کی بیشتر تہذیبوں میں اس کی کوئی سماجی حیثیت نہیں تھی، وہ حقیر اور ذلیل سمجھی جاتی تھی، اس کے معاشی اور سیاسی حقوق نہیں تھے۔ وہ آزاد مرضی سے لین دین اور کوئی مالی تصرف نہیں کر سکتی تھی۔ وہ باپ کی پھر شوہر کی اور اس کے بعد اپنی نرینہ اولاد کی تابع اور محکوم تھی۔ ان کے اقتدار کو چیلنج کرنے کی اسے اجازت نہ تھی، اس پر ظلم وستم ہو تو اس کی کہیں داد رسی نہ ہوتی تھی۔ اسے فریاد تک کا حق حاصل نہ تھا۔

اس میں شک نہیں بعض اوقات عورت کے ہاتھ میں زمامِ اقتدار بھی رہی ہے۔ ایسا بھی ہوا ہے کہ سلطنت اور حکومت اس کے اشاروں پر گردش کرتی تھی۔ یہ تو بہت دیکھنے میں آیا کہ خاندان اور قبیلہ پر وہ چھائی ہوئی تھی۔ بعض غیر متمدن قبائل میں عورت کو مرد پر ایک طرح کی بالادستی بھی حاصل رہی ہے اور اب بھی اس طرح کے قبائل موجود ہیں، لیکن اس کے باوجود بہ حیثیتِ نوع عورت کے حالات میں کچھ زیادہ فرق نہ آیا۔ وہ مظلوم کی مظلوم ہی رہی اور اس کے حقوق پر دست درازی کا سلسلہ جاری رہا۔

اسلام نے عورت کو ظلم کے گرداب سے نکالا، اس کے ساتھ انصاف کیا، اسے انسانی حقوق دیے، عزت و سربلندی بخشی اور معاشرہ کو اس کا احترام سکھایا۔ لیکن مغرب کی جو قومیں اسلام کے سایۂ رحمت میں نہ آسکیں وہ اس کے برکات وثمرات سے محروم رہیں۔ ان میں عورت کے حقوق بدستور پامال ہوتے رہے اور وہ ہر طرح کا ظلم سہتی رہی۔ موجودہ دور میں جب ان قوموں میں اس کا ردِّ عمل ہوا تو عورت کی آزادی اور مساوات کا تصوّر اُبھرا۔ اس کے حق میں دلائل فراہم کیے گئے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ نوعی اختلاف کے باوجود عورت کسی بھی طرح مرد سے فروتر نہیں ہے۔ دونوں ہر لحاظ سے ایک دوسرے کے برابر ہیں، ان میں کسی بھی پہلو سے فرق و امتیاز ناروا ہے۔ وہ ہر کام کرسکتی ہے، ہر عہدہ و منصب کی اہل ہے اور ہر طرح آزاد و خود مختار ہے، لہٰذا مرد کی بالادستی اس پر سے ختم ہونی چاہیے اور اسے وہ سارے حقوق ملنے چاہئیں جو مرد کو حاصل ہیں۔

عورت کے لیے یہ بڑا دل خوش کن تصور تھا۔ اس نے لپک کر اسے اس طرح قبول کیا جیسے فردوسِ گم گشتہ اسے مل گئی ہو اور آہستہ آہستہ معاشی، معاشرتی، سماجی اور تہذیبی امور میں مرد کی شریک بنتی چلی گئی۔ وہ کارخانوں، دفتروں اور کالجوں میں مرد کے شانہ بہ شانہ معاشی جدوجہد کر رہی تھی تو پارکوں، کلبوں، گھروں اور تفریح گاہوں میں اس کے ساتھ کھیل کود اور تفریح میں حصہ لے رہی تھی۔ اس کا وجود ہر شعبہ حیات میں ضروری قرار پایا اور اس کے بغیر زندگی بے کیف اور بے لطف تصور کی جانے لگی۔ عورت نے

اسے 'ترقی' کی طرف پیش رفت سمجھا اور ایک کے بعد دوسرا قدم اُٹھانے کے لیے بے چین اور مضطرب رہنے لگی۔ وہ اس تصورِ حیات کے ظاہری حسن پر فریفتہ تھی اور اس کے بطن میں چھپی ہوئی خرابیوں کو نہ دیکھ سکی۔

مغرب نے عورت کی آزادی کا جو تصور دیا اس کے بعض پہلو اس کے حق میں مفید تھے، لیکن بعض پہلوؤں سے وہ اس کے لیے سخت نقصان دہ بھی تھا۔ اس میں ایک طرف عورت کو مرد کے ظلم سے نجات دلائی گئی تھی تو دوسری طرف اس کی قوت و صلاحیت، مزاج اور نفسیات کی قطعاً کوئی رعایت نہیں تھی۔ یہ درحقیقت مرد کے ظلم کے خلاف ایک شدید ردِعمل تھا۔ اس میں وہ ساری بے اعتدالیاں موجود تھیں جو اس طرح کے ردِعمل میں بالعموم پائی جاتی ہیں۔

عورت کی اس بے قید آزادی نے مغرب کی پوری زندگی کو بالکل غلط رخ پر ڈال دیا ہے اور اس سے ایسا عدم توازن پیدا ہوا ہے کہ اس کے بڑے گھناؤنے نتائج سامنے آرہے ہیں بلکہ آچکے ہیں۔ اسلام اس نازک موڑ پر ہماری راہ نمائی کرتا ہے۔ وہ عورت کے بنیادی حقوق اور اس کی ہمہ جہت ترقی کی ضمانت بھی دیتا ہے اور معاشرہ کو ان تباہ کن اور ناپاک نتائج سے محفوظ بھی رکھتا ہے جن سے مغرب اس وقت دوچار ہے۔ ان میں سے بعض معاشرتی و سیاسی نتائج کا یہاں ذکر کیا جارہا ہے۔

جنسی بے راہ روی

زندگی کے ہر گوشہ میں عورت اور مرد کے آزادانہ اور بے باکانہ اختلاط کی وجہ سے جنسی آوارگی کا رجحان پیدا ہوا اور بڑھا۔ بدکاری عام ہوئی اور چھا گئی۔ پھر اس کی بنیاد پر ایک ایسی ننگی اور بے حیا تہذیب نے جنم لیا کہ اس کی عفونت اور بدبو سے اخلاق کا چمن اجڑ گیا اور شرم و حیا او رشرافت کا دم گھٹ کر رہ گیا۔

تاریخ کا تجربہ ہے کہ جب بھی عورت گھر سے نکل کر 'شمع انجمن' بنی اور مجلسوں

اور محفلوں کی رونق بڑھانے لگے تو جنسی آوارگی عام ہوئی، جو گندگی بند کمروں میں برداشت نہیں کی جاسکتی وہ بازاروں اور سڑکوں میں پھیلنے لگی، انتہائی قابل احترام اور پاکیزہ رشتے بھی اس سے محفوظ نہیں رہے۔ عام انسانوں کا ذکر ہی کیا ان کے دیوی دیوتا تک بدکاریوں میں ملوث پائے گئے اور ان کی طرف ایسی ایسی داستانیں منسوب کی جانے لگیں کہ آدمی شرم سے پانی پانی ہوجائے۔ بیسواؤں اور رنڈیوں کو وہ مقام حاصل ہوا جس سے شریف عورتیں تک محروم تھیں، آرٹ اور کلچر سے جنسی جذبات کی ترجمانی ہونے لگی، عریاں تصویریں کھنچیں، ننگے مجسمے تراشے گئے، رقص و موسیقی کے نام پر عورت سے لذت حاصل کی گئی، افسانہ، ڈرامہ، شاعری اور ادب کے ذریعہ جنسی اعمال و کیفیات کی تشریح ہونے لگی، عورت مرد کے ہاتھ میں کھلونا بن گئی اور اس کا مقصد صرف یہ رہ گیا کہ مرد کی جنسی خواہش کی تکمیل کرے۔ غرض پوری تہذیب جنس کی ترجمان بن گئی اور اسی کے ارد گرد گھومنے لگی۔ جنسی جذبات کی اس حکم رانی نے یونان، روم، مصر اور دوسری بہت سی قدیم تہذیبوں کو تباہ و برباد کردیا۔ تہذیبِ نو بھی اسی راستہ کی طرف بڑھ رہی ہے۔ شاید وہ وقت قریب آگیا ہے جب کہ یہ قصر منہدم ہوجائے اور ایک نئی تہذیب وجود میں آئے۔

خاندان کی بربادی

خاندانی نظام عورت کی وجہ سے قائم تھا۔ اس کے اندرونی نظم و نسق کو وہ سنبھالے ہوئے تھی۔ عورت کی تگ و دو جب گھر سے باہر ہونے لگی اور بیرونی مصروفیات نے اس کے اوقات کار کو گھیر لیا تو خاندان کا نظم بکھر گیا۔ اس نے جو کچھ حاصل کیا اس کی قیمت گھر کی بربادی کی شکل میں اسے ادا کرنی پڑی۔ خاندان، معاشرہ کا بنیادی پتھر ہے۔ جب یہ اپنی جگہ سے ہٹا تو پورا معاشرہ درہم برہم ہوگیا۔ عورت مرد کے لیے وجہِ سکون تھی اب نہیں رہی، ان کے درمیان اُلفت و محبت کا تعلق تھا جس کی وجہ سے زندگی کے نشیب و فراز میں وہ ایک دوسرے سے جڑے ہوئے تھے، اب یہ تعلق ٹوٹ گیا۔

والدین اور اولاد کا مضبوط رشتہ کم زور پڑ گیا۔ اولاد کے لیے والدین مرکزِ محبت ہوتے ہیں، یہ مرکز ان سے چھن گیا اور وہ نرسنگ ہاؤس کے حوالے ہوگئے۔ والدین کے بڑھاپے کا سہارا ان کی اولاد ہوتی ہے۔ یہ سہارا ٹوٹ گیا، اور وہ انتہائی بے بسی اور کس مپرسی کی حالت میں زندگی گزارنے پر مجبور ہوگئے۔ یہی نہیں وہ سارے تعلقات جو خاندان کی بقا کے ساتھ وابستہ تھے اس کے ٹوٹتے ہی ختم ہوتے چلے گئے اور انسان اس سکون سے محروم ہوگیا جو صرف خاندان ہی فراہم کرسکتا ہے۔ خاندان کا ٹوٹنا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ یہ اتنا بڑا خسارہ ہے کہ کوئی بھی معاشرہ زیادہ دن اسے برداشت نہیں کرسکتا۔ بالآخر وہ اسے لے ڈوبے گا۔

اسلام ایک مضبوط اور پائیدار خاندان کو معاشرہ کی بقا کے لیے ضروری سمجھتا ہے، اس لیے کہ خاندان ہی کی بنیاد پر معاشرے کی تعمیر ہوتی ہے۔ خاندان کا استحکام معاشرے کا استحکام اور خاندان کی بربادی معاشرہ کی بربادی ہے۔ اسلام خاندان کی تعمیر و تشکیل کے لیے بہت ہی مضبوط بنیادیں فراہم کرتا ہے اور ان اسباب وعوامل سے اسے محفوظ رکھنا چاہتا ہے جو اسے کم زور یا منہدم کرکے رکھ دیں۔ اس کا ایک پورا نظام اس نے قائم کیا ہے، اس کی تفصیلات بتائی ہیں اور حدود وضوابط متعین کیے ہیں۔ وہ اس بات کی شدت سے تاکید کرتا ہے کہ اس نظام کو جوں کا توں باقی رکھا جائے اور اللہ کے قائم کردہ حدود نہ توڑے جائیں۔ اس نظام میں عورت کی بنیادی اہمیت ہے اور وہ اس کی تعمیر کا اہم کردار ادا کرتی ہے۔ اس میں اس کے حقوق بھی ہیں اور فرائض بھی۔ اگر وہ اس سے کنارہ کش ہوجائے اور یکسوئی کے ساتھ اس کی ذمہ داریاں ادا نہ کرے تو یہ نظام بکھر کر رہ جائے گا۔ وہ اسی وقت باقی رہ سکتا ہے جب کہ عورت اسے اپنی سعی و جہد اور توجہ کا مرکز بنائے رکھے۔

حقوق اور ذمہ داریوں میں عدمِ توازن

عورت کے حقوق اور ذمہ داریوں میں عدم تناسب پیدا ہوگیا اور ان میں جو توازن اور اعتدال ہونا چاہیے وہ ختم ہوگیا۔ فطرت اس طرح عورت کی نشو ونما کرتی ہے کہ وہ ماں بن سکے اور اس کی گود میں نسلِ انسانی پروان چڑھے۔ اس کے لیے جن جذبات و احساسات اور جن قوتوں اور صلاحیتوں کی ضرورت ہے وہ بھی اسے فطرت کی طرف سے ملتے ہیں۔ اسی وجہ سے خود اس کے اندر اس فطری تقاضے کو پورا کرنے کا شدید داعیہ پایا جاتا ہے۔ لیکن ماں بن کر نسل انسانی کو آگے بڑھانا کوئی وقتی اور ہنگامی مشغلہ نہیں ہے بلکہ ایک طویل اور دشوار گزار عمل ہے۔ اس میں حمل، ولادت، رضاعت، بچہ کی پرورش اور اس کی تربیت وغیرہ شامل ہیں۔ اس سارے عمل میں مرد بعض حیثیتوں سے اس کا شریک تو ہوتا ہے اور بالواسطہ اس کے ساتھ تعاون بھی کرتا ہے لیکن براہِ راست اس کا بوجھ نہ اٹھاتا ہے اور نہ اٹھا سکتا ہے۔ یہ سارا بوجھ تنہا عورت ہی کو اٹھانا پڑتا ہے۔ اس میں اس کی توانائیوں اور صلاحیت کا بڑا حصہ صرف ہو جاتا ہے۔ اس کے ساتھ اس پر وہ ساری سیاسی، سماجی اور معاشی ذمہ داریاں بھی ڈال دینا جو مرد پر عائد ہوتی ہیں، بہت بڑی زیادتی ہے۔ اس کے لیے وجہ جواز شاید اسی وقت فراہم کیا جاسکتا ہے جب کہ عورت کو اس بوجھ سے سبک دوش کردیا جائے جو فطرت نے اس پر عائد کر رکھا ہے اور جس کے لیے خاص طریقے سے اس کی نشو ونما ہوتی ہے، لیکن عورت جب تک عورت ہے اور اس کے پاکیزہ جذبات اور اس کی بہترین صلاحیتوں کی نسل انسانی کی بقا اور اس کی ساخت و پرداخت کے لیے ضرورت ہے، اس وقت تک یہ بوجھ بہرحال اس پر باقی رہے گا۔ کسی مصنوعی طریقہ سے نہ اسے ہٹایا جاسکتا ہے اور نہ اس کا کوئی بدل فراہم کیا جاسکتا ہے۔

اس بارے میں اسلام بہت ہی معتدل اور متوازن نقطۂ نظر کا حامل ہے۔ اس نے عورت کو وہ سارے معاشی سیاسی اور سماجی حقوق دیے ہیں جو مرد کو دیے ہیں، البتہ اسے بعض ان ذمہ داریوں سے مستثنیٰ کر رکھا ہے جو اس کے مزاج اور جسمانی ساخت

سے مناسبت نہیں رکھتیں اور جن کے اٹھانے کے بعد وہ اپنی فطری ذمہ داریوں کو پورا نہیں کرسکتی۔ اسے ایک مثال سے سمجھا جاسکتا ہے۔ اسلامی ریاست کا سربراہ مرد ہی ہوسکتا ہے، اسی طرح ملک کے دفاع کی ذمہ داری بھی براہِ راست اسی پر ہے۔ گو یہ ذمہ داریاں عورت پر نہیں ڈالی گئی ہیں لیکن اسے دوسرے سارے سیاسی حقوق حاصل ہیں۔ وہ سیاست میں رائے اور مشورے دے سکتی ہے، تنقید اور احتساب کا اسے حق حاصل ہے، وہ ریاست کے بڑے سے بڑے صاحبِ منصب حتیٰ کہ حاکم وقت کو بھی برسرِ عام ٹوک سکتی ہے۔ اس کے اس حق پر کوئی پابندی نہیں لگائی جاسکتی۔ ایک اور مثال لیجیے عورت پر کسی کی معاشی ذمہ داری نہیں ہے۔ لیکن اس کے ساتھ اسے معاشی جدو جہد کا حق حاصل ہے۔ وہ اسلام کے قائم کردہ حدود کے اندر یہ جدو جہد کرسکتی ہے۔

اسلام نے مرد پر جو ذمہ داریاں ڈالی ہیں، ان کی تکمیل کے لیے اسے کچھ زیادہ حقوق بھی دیے ہیں، لیکن اس میں اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ عدل و انصاف برقرار ہے اور عورت پر کسی قسم کی زیادتی نہ ہونے پائے۔ اس کے لیے اسلام نے ایک طرف مرد پر سخت قانونی بندشیں عائد کر رکھی ہیں کہ وہ اپنے حقوق و اختیارات کا غلط استعمال نہ کرسکے اور دوسری طرف عورت کے حقوق محفوظ کردیے ہیں کہ ان کی پامالی کی وہ کسی حال میں اجازت نہیں دیتا۔ خاندان میں مرد قوام اور نگران ہے لیکن قانوناً وہ اس کے ساتھ کسی قسم کی زیادتی نہیں کرسکتا۔ جب بھی اس کی طرف سے کوئی زیادتی ہوگی قانون اس کی گرفت کے لیے موجود ہوگا۔ یہی نہیں سربراہِ مملکت بھی اس کی جان، مال، عزت، آبرو اور دوسرے انفرادی و اجتماعی حقوق پر دست درازی کا اختیار نہیں رکھتا، ورنہ وہ قانون کے سامنے ایک عام فرد کی طرح جواب دہ ہوگا۔

عورت سے ہم دردی کے جذبہ میں کمی

آخری بات یہ کہ مرد نے عورت پر، بے شک بڑی زیادتیاں کی ہیں لیکن اس کے ساتھ اس کے اندر عورت سے محبت اور ہم دردی کا ایک فطری جذبہ بھی ہے۔ اسلام

اس جذبہ کو اُبھارتا اور نشو و نما دیتا ہے۔ وہ اس بات کی ترغیب دیتا ہے کہ عورت کے قانونی حقوق ہی ادا نہ کیے جائیں بلکہ اس کے ساتھ ہم دردی کا رویہ اختیار کیا جائے۔ وہ حسنِ سلوک کی مستحق ہے لہٰذا اس کے ساتھ حسنِ سلوک ہونا ہی چاہیے۔ اس جذبہ کی عورت اور مرد کے تعلقات میں اساسی اہمیت ہے۔ موجودہ دور میں عورت اور مرد کے درمیان حقوق کی جنگ نے اس جذبہ کو مجروح اور نیم جان کر دیا ہے۔ کبھی کبھی تو خیال ہوتا ہے کہ شاید یہ مقدس جذبہ دم توڑ چکا ہے۔ اس سے عورت کا بڑا نقصان ہوا ہے۔ اس لیے کہ صرف قانون، چاہے وہ آبِ زر ہی سے کیوں نہ لکھ دیا جائے اس کے مسائل حل نہیں کرسکتا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ عورت اور مرد کے درمیان مساوات کا دعویٰ تو کیا جاتا ہے لیکن عملاً مساوات نہیں برتی جاتی، قانون نے اسے جو سیاسی سماجی اور معاشرتی حقوق دیے ہیں ان سے وہ پوری طرح بہرہ یاب نہیں ہے اور کہیں کہیں تو اس پر ظلم و زیادتی آخری حد کو پہنچ چکی ہے، مرد کی خواہشات کی تکمیل کے لیے اس کی باقاعدہ خرید و فروخت ہو رہی ہے، اس کی جان و مال پر حملے ہو رہے ہیں اور اس کی عصمت و آبرو بے دریغ لوٹی جا رہی ہے۔ اب تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے قدم قدم پر ہونے والے نت نئے حملوں کا دفاع کرنا بھی اسے دشوار ہو رہا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ کسی کم زور کے حقوق تسلیم کر بھی لیے جائیں تو ان سب کا اسے ملنا آسان نہیں ہے۔ عورت لڑ کر یہ حقوق مرد سے حاصل نہیں کرسکتی۔ وہ اسے صرف اسی صورت میں مل سکتے ہیں جب کہ مرد انھیں دینا چاہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ اس کے اندر ہم دردی اور محبت کا جذبہ ہو اور وہ عورت کے ساتھ زیادتی کو جرم اور گناہ سمجھے۔ اسلام نے اس معاملہ میں بے نظیر کامیابی حاصل کی ہے۔ تاریخ کے اس تجربہ کو جب بھی دہرایا جائے گا معاشرہ میں ایک بار پھر وہی بہار آئے گی جسے دنیا اس سے پہلے دیکھ چکی ہے۔

مسلمان عورت

کے

حقوق

مسلمان عورت کے حقوق

عام طور پر کم زور کو اپنے حقوق حاصل کرنے کے لیے سخت جدوجہد اور کش مکش کرنی پڑتی ہے۔ اس کے بغیر اسے اس کے جائز حقوق نہیں ملتے بلکہ وہ تسلیم بھی نہیں کیے جاتے۔ موجودہ دور نے بڑی بحث وتمحیص، بڑی رد وکد اور بڑے احتجاج کے بعد عورت کے بعض بنیادی حقوق تسلیم کیے ہیں۔ اسے اس دور کا احسان مانا جاتا ہے حالاں کہ یہ احسان اسلام کا ہے۔ سب سے پہلے اس نے عورت کو وہ حقوق دیے جن سے وہ عرصۂ دراز سے محروم چلی آرہی تھی۔ یہ سارے حقوق اسلام نے اس لیے نہیں دیے کہ عورت ان کا مطالبہ کر رہی تھی، اس کا احتجاج جاری تھا اور اس کے حقوق کی وکالت اور نمایندگی ہو رہی تھی بلکہ اس لیے دیے کہ عورت کے یہ فطری حقوق تھے اور اسے ملنے ہی چاہیے تھے۔ اسلام ان حقوق کے دینے پر مجبور نہیں تھا بلکہ اس لیے اس نے دیے کہ عورت مظلوم تھی اور مظلوم کی حمایت کو وہ فرض سمجھتا تھا۔

یہاں بعض ان حقوق کا ذکر کیا جا رہا ہے جو اسلام نے عورت کو دیے ہیں۔ اسلام ان حقوق کو صرف قانون کی زبان میں بیان کرکے خاموش نہیں ہو جاتا بلکہ ترغیب وترہیب کے ذریعہ ان کے ادا کرنے کا زبردست جذبہ بھی پیدا کرتا ہے۔

زندہ رہنے کا حق

عورت کا جو حال پوری دنیا میں تھا وہی عرب میں تھا۔ عرب کے بعض قبائل

اپنی لڑکیوں کو زندہ دفن کردیتے تھے۔ قرآن مجید نے اس شقاوت اور سنگ دلی پر سخت تہدید کی، اسے زندہ رہنے کا حق دیا اور کہا کہ جو شخص اس کے اس حق پر دست درازی کرے گا قیامت کے روز اسے اللہ تعالیٰ کو جواب دینا ہوگا۔ فرمایا:

وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ ۝ بِاَیِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ ۝ (التکویر: ۸، ۹)

اس وقت کو یاد کرو جب کہ اس لڑکی سے پوچھا جائے گا جسے زندہ دفن کیا گیا تھا کہ کس جرم میں اسے مارا گیا۔

ایک طرف معصوم اور بے گناہ لڑکیوں کے ساتھ اس ظلم و زیادتی پر جہنم کی وعید سنائی گئی تو دوسری طرف ان لوگوں کو جنت کی خوش خبری دی گئی جن کا دامن اس ظلم سے پاک ہو، جو لڑکیوں کے ساتھ وہی سلوک کریں جو لڑکوں کے ساتھ کرتے ہیں اور دونوں میں کسی قسم کا فرق نہ کریں۔ چناں چہ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

من كانت لـه انثٰى فلم يئدها ولم يهنها ولم يؤثر ولده عليها يعنى الذكور ادخله الله الجنة.[1]

جس شخص کے لڑکی ہو۔ وہ نہ تو اسے زندہ درگور کرے اور نہ اس کے ساتھ حقارت آمیز سلوک کرے اور نہ اس پر اپنے لڑکے کو ترجیح دے تو اللہ تعالیٰ اسے جنت میں داخل فرمائے گا۔

ان اخلاقی تعلیمات کے ساتھ اسلام نے مرد کی طرح عورت کی زندگی کے بھی احترام کی تعلیم دی اور اس پر کسی قسم کی زیادتی ہو تو 'قصاص' کا اسے حق دیا۔ قصاص کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی کے ساتھ زیادتی ہو تو اسی کے مثل اسے بدلہ لینے کا حق ہے۔ یہاں تک کہ اگر کوئی کسی کو قتل کردے تو مقتول کے وارث اس کی جان بھی لے سکتے ہیں۔ یہ قانون عورت اور مرد دونوں کے لیے ہے۔ چناں چہ قرآن میں ہے:

وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيْهَآ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ ۙ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْاَنْفَ

تورات میں ہم نے یہودیوں پر یہ حکم لکھ دیا تھا کہ جان کے بدلے جان، آنکھ کے

---

[1] ابوداؤد، کتاب الادب، باب فضل من عال یتامیٰ

بِالْاَنْفِ وَالْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهٖ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهٗ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ○ (البقرہ:۴۵)

بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک، کان کے بدلے کان، دانت کے بدلے دانت، اور زخموں کا بدلہ ان کے برابر۔ پھر جس نے قصاص کو معاف کردیا تو وہ اس کے لیے کفارہ ہے۔ اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی ظالم ہیں۔

تورات کے اس قانون کو اسلام نے زندہ کیا اور وہ اسلامی شریعت کا ایک جزء بن گیا۔ اس قانون نے عورت ہی پر نہیں بلکہ ہر کم زور فرد اور طبقہ پر ہونے والے ظلم و تعدی کو روکا اور اسے انصاف دلایا۔[1]

پرورش کا حق

اسلام کے نزدیک ہر بچہ یہ اخلاقی اور قانونی حق لے کر پیدا ہوتا ہے کہ اس کی ضروریاتِ زندگی فراہم کی جائیں اور اسے موت کے منہ میں جانے نہ دیا جائے۔ بچہ کی پرورش اور دیکھ بھال ایک طویل اور تھکا دینے والا عمل ہے۔ بالعموم لڑکے کی پرورش جس محبت، توجہ اور خوش دِلی سے ہوتی ہے لڑکی کی نہیں ہوتی۔ اسلام نے اس فرق کو سخت ناپسندیدہ قرار دیا، لڑکی کی پرورش کی خاص ترغیب دی اور اسے بہت بڑا کارِ ثواب بتایا۔ حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

من بلی من هٰذه البنات شیئا فاحسن الیهن کن له سترا من النار[2]

اللہ تعالیٰ جس شخص کو ان لڑکیوں کے ذریعہ کچھ بھی آزمائش میں ڈالے اور وہ ان کے ساتھ اچھا سلوک کرے تو وہ اس کے لیے جہنم سے بچاؤ کا ذریعہ ہوں گی۔

---

[1] عورت کے قصاص اور دیت کے موضوع پر تفصیلی بحث آگے آرہی ہے۔

[2] بخاری، کتاب الادب، باب رحمۃ الولد وتقبیلہ۔ مسلم، ابواب البر والصلۃ، باب فضل الاحسان الی البنات۔

اس حدیث میں لڑکیوں کے ساتھ احسان کا ذکر ہے۔ یہ ایک جامع لفظ ہے۔ اس میں ان کی پرورش، تعلیم و تربیت، ان کے ساتھ حسنِ سلوک اور محبت کا رویہ سب کچھ آجاتا ہے۔ حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

من عال جاریتین حتّٰی تبلغا جاء یوم القیامۃ انا وھو وضم اصابعہ[1]

جو شخص دو بچیوں کی ان کے جوانی کو پہنچنے تک پرورش کرے گا قیامت کے روز میں اور وہ اس طرح ہوں گے، یہ کہہ کر آپ نے انگشت ہائے مبارک کو ملایا۔

اب اس کی قانونی حیثیت دیکھئے۔ شریعت کی رو سے اولاد کے نان ونفقہ اور پرورش کی ذمہ داری قانوناً باپ پر عائد ہوتی ہے۔ اولاد میں لڑکے یا لڑکی کی تخصیص نہیں ہے۔ اس میں دونوں شامل ہیں۔ اس لیے لڑکا ہو یا لڑکی ان میں سے کسی کی بھی پرورش کی ذمہ داری سے وہ انکار نہیں کرسکتا۔ چناں چہ احکامِ رضاعت کے ذیل میں قرآن مجید کا ارشاد ہے:

وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَـهٗ رِزْقُهُنَّ وَ كِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ (البقرہ:۲۳۳)

بچہ جس کا ہے (یعنی باپ) اس پر دودھ پلانے والی کا کھانا اور کپڑا دستور کے مطابق واجب ہے۔

اس سلسلہ میں فقہاء نے خاصی تفصیلات فراہم کی ہیں۔ فقہاءِ احناف نے لکھا ہے کہ لڑکے کے نان ونفقہ کی ذمہ داری اس کے بالغ ہونے تک ہے۔ اس کے بعد باپ کی ذمہ داری ختم ہوجاتی ہے۔ الاّ یہ کہ وہ اپاہج یا معذور ہو۔ البتہ لڑکی کے نان ونفقہ کی ذمہ داری اس کے بالغ ہونے کے بعد بھی (شادی ہونے تک) باقی رہے گی۔ ایک رائے یہ بھی ہے کہ بلوغ کے بعد یہ ذمہ داری باپ اور ماں کے درمیان تقسیم ہوجائے گی۔ باپ دو حصے برداشت کرے گا اور ماں ایک حصہ۔ اسی طرح جو بالغ عورت بھی محتاج ہے اس کا نان ونفقہ اس کے قریبی محرم پر واجب ہوگا۔ البتہ اگر وہ صاحبِ حیثیت

---

[1] مسلم، ابواب البر والصلہ، باب فضل الاحسان الی البنات

ہے تو اسی کے مال میں سے اس پر خرچ کیا جائے گا۔ کسی اور پر اس کی ذمہ داری عائد نہیں ہوگی۔[1]

تعلیم کا حق

انسان کی ترقی علم سے وابستہ ہے۔ جو فرد یا گروہ علم سے بے بہرہ ہو وہ زندگی کی تگ و دو میں پیچھے رہ جاتا ہے۔ نہ تو اس کی فکری پرواز بلند ہوسکتی ہے اور نہ اس کی مادی ترقی ہی کا بہت زیادہ امکان ہے۔ لیکن اس کے باوجود تاریخ کا ایک طویل دور ایسا گزرا ہے جس میں عورت کے لیے علم کی اہمیت محسوس نہیں کی گئی۔ علم کا میدان صرف مرد کا سمجھا جاتا تھا، مردوں میں بھی خاص طبقات علم حاصل کرتے تھے، عورت علم کی بارگاہ سے بہت دور، جہالت کی زندگی بسر کر رہی تھی۔

اسلام نے علم کے دروازے عورت اور مرد دونوں کے لیے کھلے رکھے۔ اس راہ کی پابندیاں ختم کیں، اور ہر طرح کی آسانیاں فراہم کیں۔ اس نے خاص لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کی طرف توجہ دلائی، اس کی ترغیب دی اور اسے کارِ ثواب بتایا۔ حضرت ابوسعید خدریؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

من عال ثلاث بنات فاذبھن و زوّجھن واحسن الیھن فلہ الجنۃ[2]

جس نے تین لڑکیوں کی پرورش کی، ان کو تعلیم و تربیت دی، ان کی شادی کی اور ان کے ساتھ (بعد میں بھی) حسنِ سلوک کیا تو اس کے لیے جنت ہے۔

اسلام کا خطاب عورت اور مرد دونوں سے ہے۔ اس نے ان میں سے ہر ایک کو عبادات، اخلاق اور احکام شریعت کا پابند بنایا ہے۔ علم کے بغیر ان کی پابندی نہیں ہوسکتی۔ عورت کے لیے مرد سے تعلقات کا مسئلہ بڑا اہم ہے۔ یہ تعلقات انتہائی پیچیدہ

---

[1] ملاحظہ ہو، ہدایہ: ۲/۴۲۶-۴۲۷

[2] ابوداؤد، کتاب الادب، باب فی فضل من عال یتامیٰ

اور بڑی نزاکت کے حامل ہوتے ہیں۔ ان میں عورت کے حقوق بھی ہیں اور ذمہ داریاں بھی۔ جب تک اسے ان کا علم نہ ہو وہ ٹھیک ٹھیک نہ تو اپنی ذمہ داریاں ادا کرسکتی ہے اور نہ اپنے حقوق کی حفاظت ہی اس سے ہوسکتی ہے۔

فقہاء نے لکھا ہے کہ عورت اور مرد دونوں ہی کے لیے کم از کم دین کی بنیادی باتوں کا جاننا ضروری ہے۔ عورت اگر ان سے ناواقف ہو تو شوہر اسے خود بتائے گا یا کوئی ایسا انتظام کرے گا کہ وہ ان کا علم حاصل کرسکے۔ اگر شوہر اس کا انتظام نہ کرے تو عورت خود سے انھیں سیکھنے کی کوشش کرے گی۔ یہ اس کا ایک قانونی حق ہے۔ اس کے لیے وہ گھر سے باہر بھی (اخلاقی حدود کی پابندی کے ساتھ) جاسکتی ہے۔ شوہر اس پر پابندی نہیں لگا سکتا۔[1]

ان سب باتوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ دور اوّل میں جس طرح مردوں میں علم پھیلا عورتوں میں بھی عام ہوا۔ صحابہ کے درمیان قرآن و حدیث کا علم رکھنے والی خواتین کافی تعداد میں ہمیں ملتی ہیں۔ قرآن و حدیث کی روشنی میں مسائل کا استنباط اور فتویٰ دینا بڑا نازک اور مشکل کام ہے۔ اس میدان میں بھی عورتیں موجود تھیں۔ ان میں حضرت عائشہؓ، حضرت ام سلمہؓ، اُم عطیہؓ، حضرت صفیہؓ، حضرت ام حبیبہؓ، اسما بنت ابو بکرؓ، اُم شریکؓ، فاطمہ بنت قیسؓ، خولاء بنت تویتؓ بہت نمایاں رہی ہیں۔[2]

نکاح کا حق

عورت کو جس طرح زندگی کے اہم معاملات و مسائل میں بولنے کا حق نہیں تھا اسی طرح وہ اپنی شادی اور نکاح کے بارے میں بھی زبان نہیں کھول سکتی تھی۔ اس کے ماں باپ یا خاندان کے بزرگ جس شخص کے ساتھ اس کا رشتہ کردیتے اس سے انکار کی اسے مجال نہ تھی۔ اس معاملہ میں اس کا زبان کھولنا سخت ناپسندیدہ اور معیوب سمجھا جاتا تھا

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھی جائے۔ راقم کی کتاب 'عورت ـــــ اسلامی معاشرے میں'

[2] ملاحظہ ہو اعلام الموقعین: ۱/۹/۱۱

اور سوسائٹی اسے طرح طرح کے معنی پہنانے لگتی تھی۔ اپنے رشتہ کے بارے میں اظہارِ خیال کرنا اور اپنے بڑوں کے منتخب کردہ رشتہ کو رد کرنا آوارگی اور بدچلنی کی علامت تصور کیا جاتا تھا۔

کہا جاتا ہے کہ لڑکی کو نکاح کا اختیار دے دینا خود اس کے مفاد کے خلاف ہے۔ وہ اپنی کم سمجھی اور ناتجربہ کاری کی وجہ سے غلط فیصلہ کرسکتی ہے۔ لڑکی کے ماں باپ یا اس کے سرپرست اس سے زیادہ تجربہ کار اور معاملہ فہم ہوتے ہیں اس لیے ان سے غلطی کا امکان کم ہے۔ اس کے ساتھ وہ لڑکی کے خیر خواہ ہوتے ہیں وہ بہرحال اسے دھوکا نہیں دے سکتے۔

اس میں شک نہیں کہ یہ بات بڑی حد تک صحیح ہے کہ لڑکی کے سرپرست اس کے لیے بہتر رشتہ تلاش کرسکتے ہیں، لیکن اس کے ساتھ اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ بعض اوقات سرپرستوں کی طرف سے زیادتی بھی ہوتی ہے۔ وہ اسے اپنے ذاتی مفاد کی تکمیل کا ذریعہ بھی بنا بیٹھتے ہیں۔ کم از کم اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ بسا اوقات سرپرست کے سامنے وہ معیارات نہیں ہوتے، جنھیں خود لڑکی اہمیت دیتی ہے۔ اس لیے لڑکی کے نکاح کا اختیار بالکلیہ اس کے سرپرست کو دے دینا صحیح نہیں ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ کسی عورت اور مرد کا رشتۂ نکاح میں منسلک ہونا ان کے لیے بڑا اہم واقعہ ہے۔ اس سے دونوں ایک نئی زندگی کا آغاز کرتے ہیں۔ اس لیے یہ رشتہ ان کی باہم رضامندی سے ہونا چاہیے۔ یہ بات معقول نہ ہوگی کہ عورت پر اس کی مرضی کے خلاف نکاح کا فیصلہ مسلط کر دیا جائے۔

اسلام نے نکاح کے معاملہ میں لڑکی کے ولی اور سرپرست کو اہمیت ضرور دی ہے لیکن اس کے ساتھ یہ بھی کہا ہے کہ نکاح اس کی اجازت سے ہوگا۔ اگر عورت بیوہ یا مطلقہ ہے تو صراحت سے اپنی رضامندی کا اظہار کرے گی اور باکرہ ہے تو اس کی خاموشی کو اس کا اتفاق سمجھا جائے گا۔ حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا:

لا تنكح الايم حتىٰ تستأمر ولا تنكح البكر حتى تستأذن	بیوہ یا مطلقہ کا نکاح نہیں کیا جائے گا جب تک کہ اس کی رائے نہ معلوم کرلی جائے۔ دوشیزہ کا نکاح نہیں ہوگا جب تک کہ اس سے اجازت نہ لے لی جائے۔

صحابہ نے عرض کیا باکرہ تو شرم و حیا کی وجہ سے بولے گی نہیں اس سے اجازت کیسے لی جائے؟ آپ نے فرمایا اس کا سکوت ہی اس کی اجازت ہے[1]

اگر کسی عورت کا ولی اس کا نکاح کردے اور وہ اسے تسلیم نہ کرے تو نکاح کالعدم سمجھا جائے گا۔ چناں چہ خنساء بنت خذام کا نکاح ان کی مرضی کے خلاف ان کے باپ نے کر دیا تو رسول اللہ ﷺ نے یہ نکاح ختم کرا دیا[2]

اس سلسلہ کے اور بھی واقعات حدیث کی کتابوں میں ملتے ہیں، نابالغ لڑکی کا نکاح اس کا ولی اور سرپرست کرسکتا ہے لیکن فقہاء نے لکھا ہے کہ بلوغ کے بعد اسے اختیار ہوگا کہ وہ چاہے تو اسے قبول کرے یا رد کر دے۔

مہر کا حق

اسلام نے مرد کو حکم دیا ہے کہ جس عورت سے اس کا نکاح ہو اسے لازماً مہر ادا کرے، مہر کے بغیر نکاح اس کے نزدیک صحیح نہیں ہے۔ نکاح میں عورت کو مہر دینے کا تصور اسلام سے پہلے دورِ جاہلیت میں بھی تھا لیکن اہل عرب نے عملاً اسے اس سے محروم کر رکھا تھا۔ اس کی مختلف شکلیں تھیں۔

۱- عورت کا سرپرست اس کے مہر کو اپنی ملکیت سمجھتا اور جو مہر ملتا اس پر قبضہ کرلیتا۔ وہ یوں تو لڑکی کو باعث عار سمجھتے تھے اور اس کی پیدائش سے ان پر غم و اندوہ کے بادل چھا جاتے تھے لیکن اس پہلو سے وہ ان کے لیے ایک طرح سے خوشی کا سبب بھی تھی کہ اس کے مہر سے ان کی دولت میں اضافہ ہوگا۔ چناں چہ وہ لڑکی کو 'النافجة'

---

[1] بخاری، کتاب النکاح، باب لاینکح الاب وغیرہ البکر والثیب الا برضاہا۔ مسلم، کتاب النکاح۔

[2] بخاری، کتاب النکاح، باب اذا زوج ابنتہ وھی کارھۃ۔

(اضافہ کرنے والی) کہتے تھے۔ اور اس کی پیدائش پر ان الفاظ میں مبارک باد دی جاتی تھی۔ 'ھنیئًا لک النافجہ'[1] (مبارک ہو تمہارے لیے دولت بڑھانے والی) مہر میں چوں کہ وہ اونٹ لیتے تھے اس کا مطلب یہ ہوتا کہ لڑکی کی جب شادی ہوگی تو اس کے مہر میں جو اونٹ ملیں گے اس سے تم اپنے اونٹوں کی تعداد بڑھاؤ گے۔

۲- ایسا بھی ہوتا تھا کہ کوئی آدمی مرجاتا اور اس کی بیوہ موجود ہوتی تو اس کی دوسری بیوی کا لڑکا یا کوئی رشتہ دار ایک چادر اس عورت پر یہ کہہ کر ڈال دیتا کہ مرنے والے کے مال کی طرح میں اس کا بھی وارث ہوں۔ اس سے اس عورت پر اس کا حق ثابت ہوجاتا۔ نہ تو کوئی دوسرا اس کا دعویٰ کرسکتا تھا اور نہ خود عورت اس کی مرضی کے خلاف کچھ کرسکتی تھی۔ وہ اس سے شادی کرنا چاہتا تو قدیم مہر ہی کی بنیاد پر اس سے شادی کرلیتا، اگر کسی دوسرے شخص سے اس کا نکاح کرتا تو اس کے مہر پر قبضہ کرلیتا اور اسے بالکلیہ اس سے محروم کردیتا۔[2]

۳- کبھی اس کی مجبوری سے فائدہ اُٹھا کر اسے کم مہر بھی دیا جاتا تھا۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: کوئی یتیم لڑکی کسی کی سرپرستی میں ہوتی اور وہ اس کی خوب صورتی اور مال و دولت کی وجہ سے خود اس سے نکاح کرنا چاہتا تو کسی دوسرے سے اس کا نکاح نہیں کراتا تھا بلکہ خود نکاح کرلیتا اور اسے اتنا مہر نہیں دیتا جتنا کہ دوسرا شخص اسے دینے کے لیے تیار ہوتا۔ قرآن نے اس سے منع کیا اور کہا کہ اگر ان یتیم لڑکیوں کے ساتھ شادی کرنا چاہو تو انھیں پورا مہر دو۔ ورنہ کسی دوسری عورت سے شادی کرلو۔[3]

۴- دورِ جاہلیت میں عورت کا مہر ختم کرنے کی ایک صورت وہ بھی تھی جسے حدیث میں 'شغار' کہا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص اپنی لڑکی کا نکاح کسی

---

[1] ابن منظور۔ لسان العرب، مادہ ن، ف، ج۔ تفسیر کبیر: ۱۴۴/۳

[2] تفسیر کبیر: ۱۷۹/۳

[3] بخاری، کتاب التفسیر، سورۃ النساء، باب وَ اِنْ خِفْتُمْ اَنْ لَّا تُقْسِطُوْا الآیہ

سے اس شرط کے ساتھ کرے کہ وہ اس کے عوض اپنی لڑکی اس کے نکاح میں دے دے اور اس ادل بدل کی شادی میں دونوں لڑکیوں میں سے کسی کا مہر نہ ہو۔

اسلام نے جاہلیت کے اس طریقہ کو ختم کردیا۔ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

نَهٰی رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الشِّغَارِ[۱] — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شغار سے منع فرمایا ہے۔

ایک اور روایت کے الفاظ ہیں:

لاشغار فی الاسلام[۲] — اسلام میں شغار نہیں ہے۔

بخاری کی روایت میں بغیر مہر کے بیٹیوں کے تبادلہ کا ذکر ہے۔ مسلم کی ایک روایت میں بہنوں کے بھی تبادلے کا ذکر ہے۔ یہ دونوں مثالیں ہیں ورنہ جیسا کہ امام نووی نے فرمایا ہے کہ علما کا اس پر اجماع ہے کہ ان کے علاوہ بھتیجوں، پھوپھیوں اور چچا زاد بہنوں وغیرہ کا تبادلہ بھی اسی ممانعت میں آتا ہے[۳]۔ علما کا اس پر تو اجماع ہے کہ جاہلیت کے اس طریقے کو اسلام نے ممنوع قرار دیا ہے۔ البتہ اس میں اختلاف ہے کہ اس طرح کا نکاح ہوجائے تو اس کا کیا حکم ہے؟ کیا یہ نکاح معتبر ہوگا یا باطل قرار پائے گا؟

ابوداؤد کی ایک روایت میں ہے کہ حضرت عبد اللہ ابن عباسؓ کے صاحب زادے عباس نے اپنی لڑکی کا نکاح عبد الرحمٰن بن حکم سے اور عبد الرحمٰن بن حکم نے اپنی لڑکی کا نکاح عباس سے کردیا اور اس ادل بدل کو دونوں کا مہر قرار دے دیا۔ حضرت معاویہؓ کو

---

۱ بخاری، کتاب النکاح، باب الشغار۔ مسلم، کتاب النکاح، باب تحریم نکاح الشغار وبطلانہ

۲ مسلم، حوالہ سابق، ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ شغار کی مذکورہ بالا تشریح رسول اللہ صلعم نے خود فرمائی۔ لیکن یہ روایت سند کے لحاظ سے زیادہ قوی نہیں ہے زیادہ تر روایتوں میں یہ تشریح حضرت عبد اللہ بن عمرؓ اور ان کے شاگرد نافع سے مروی ہے۔ یہ بھی ایک مستند تشریح ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔ فتح الباری: ۹/۱۲۸

۳ شرح مسلم: ۱/۴۵۵-۴۵۴

جب اس کی اطلاع ملی تو انھوں نے اپنے گورنر مدینہ مروان کو لکھا کہ ان کے درمیان تفریق کردی جائے، اس لیے کہ یہی وہ 'شغار' ہے جس سے نبی ﷺ نے منع فرمایا تھا[۱]

امام مالک، امام شافعی اور امام احمد وغیرہ کے نزدیک یہ نکاح باطل ہے۔ امام ابو حنیفہؒ اور سفیان ثوریؒ وغیرہ فرماتے ہیں کہ نکاح تو صحیح ہے البتہ دونوں کا مہرِ مثل واجب ہوگا۔ ان کے نزدیک اس میں خرابی محض مہر کے نہ ہونے کی وجہ سے ہے۔ یہ خرابی مہرِ مثل سے دور ہوجاتی ہے[۲]

اس طرح اسلام نے مہر کو بلا شرکتِ غیرے تنہا عورت کا حق قرار دیا اور اس حق پر ہونے والی تمام زیادتیوں کو ایک ایک کرکے ختم کیا۔ اس نے صاف لفظوں میں حکم دیا۔

وَ اٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً (النساء:۴) عورتوں کو ان کے مہر خوش دلی سے دو۔

علامہ ابوبکر جصاص اس کی تشریح میں فرماتے ہیں:

ان المهر لها وهي المستحقة له لاحق للولی فيه[۳]	مہر اس کی ملکیت ہے، وہی اس کی مستحق ہے، اس کے سرپرست کا اس میں کوئی حق نہیں ہے۔

شریعت نے مہر کی کوئی حد مقرر نہیں کی ہے۔ یہ آدمی کی حیثیت کے مطابق کم یا زیادہ ہوسکتا ہے۔ البتہ اس کا رجحان یہ ضرور ہے کہ مہر اتنا ہونا چاہیے کہ آدمی اسے آسانی سے ادا کرسکے۔ فقہاء کے درمیان مہر کی کم از کم مقدار کے تعین میں اختلاف ہے۔ فقہاء احناف کے نزدیک اسے دس درہم سے کم نہیں ہونا چاہیے[۴]

اس سے واضح ہے کہ مہر کم ہو یا زیادہ، عورت کا ایک قانونی حق ہے۔ از روئے شرع اسے اس سے محروم نہیں کیا جاسکتا۔ بعض اوقات مہر کو عورت کی شان کے خلاف سمجھا جاتا ہے۔ اس پر کچھ اور اعتراضات بھی ہیں۔ اس پر تفصیلی بحث آگے آرہی ہے۔

---

۱ ابوداؤد، کتاب النکاح، باب فی الشغار۔

۲ معالم السنن: ۱۹۲/۳۔ شرح مسلم للنووی: ۴۵۴/۱۔

۳ احکام القرآن: ۶۹/۲۔

نان ونفقہ کا حق

شادی سے پہلے لڑکی کی پرورش کی ذمہ داری باپ کی ہے۔ شادی کے بعد اس کے نان ونفقہ کی ذمہ داری شوہر پر عائد ہو جاتی ہے۔ شریعت کی رو سے بیوی امیر ہو یا غریب اس کا نان ونفقہ شوہر پر واجب ہے۔ فقہ حنفی میں کہا گیا ہے کہ میاں بیوی دونوں صاحبِ حیثیت ہوں تو بیوی کا نفقہ اسی کی حیثیت کے مطابق ہوگا۔ بیوی غریب اور شوہر مال دار ہو تو اس کا نفقہ غریب اور امیر کے نفقہ کے درمیان یعنی غریب کے نفقہ سے زیادہ اور امیر کے نفقہ سے کم ہوگا۔ لیکن اگر بیوی مال دار اور شوہر غریب ہے تو مرد اپنی حیثیت کے مطابق خرچ کرے گا اور باقی اس کے ذمہ قرض ہوگا جسے وہ حسب سہولت ادا کرے گا۔

عورت اگر صاحبِ حیثیت ہے تو اس کے لیے خادم بھی فراہم کیا جائے گا۔ بیوی شوہر کے رشتہ داروں کے ساتھ مل کر رہنا نہ چاہے تو وہ الگ مکان کا مطالبہ کرسکتی ہے۔ یہ اس کا قانونی حق ہے اور شوہر کے لیے اس کا پورا کرنا ضروری ہے۔

اس ذیل میں یہ بیان کر دینا بھی مناسب ہی ہوگا کہ شوہر کی خدمت اور گھر کا کام کاج فقہ حنفی کے مطابق عورت کی ذمہ داری نہیں ہے۔ وہ یہ سب کچھ کرتی ہے تو یہ اس کا اخلاق اور حسنِ سلوک ہے۔ اس پر اسے مجبور نہیں کیا جاسکتا۔[۱]

کاروبار اور عمل کی آزادی کا حق

اسلام نے عورت کو کاروبار، پیشہ اور عمل کی آزادی دی ہے۔ اس کے لیے تجارت، زراعت، لین دین، صنعت وحرفت، ملازمت، درس وتدریس، صحافت وتصنیف سب ہی جائز کاموں کی اجازت ہے۔ اس کے لیے وہ گھر سے باہر بھی نکل سکتی ہے۔

---

[۱] یہ تفصیلات فقہ حنفی کی بیان کی گئی ہیں (ہدایہ: ۲/۴۱۷-۴۱۹) دوسری فقہوں میں بعض جزئیات میں تھوڑا بہت اختلاف ہے۔

البتہ اس پر وہ بعض پابندیاں عائد کرتا ہے۔ ان پابندیوں کے دو مقاصد ہیں۔ ایک یہ کہ خاندان کے نظام میں کوئی خلل اور انتشار نہ پیدا ہو اور اس کے استحکام میں فرق نہ آئے۔ دوسرے یہ کہ عورت باعفت زندگی گزار سکے اور اسے ایسے حالات میں نہ ڈالا جائے کہ اس کے لیے اخلاقی حدود میں قائم رہنا دشوار ہو جائے[1]

مال و جائداد کا حق

دنیا کی بہت سی قومیں وہ تھیں جن میں عورت کو حقِ ملکیت حاصل نہ تھا۔ اس کا خاندان کی جائداد میں کوئی حصہ نہ تھا بلکہ وہ اپنی محنت سے جو کچھ حاصل کرتی اسے بھی باپ، بیٹے، شوہر یا خاندان کے دوسرے افراد کی ملکیت سمجھا جاتا۔ اسلام نے عورت کے حقِ ملکیت کو تسلیم کیا اور اس میں مداخلت کو غلط اور ناجائز ٹھہرایا۔ اس کے نزدیک جائز ذرائع سے حاصل شدہ دولت پر جس طرح مرد کو حقِ ملکیت حاصل ہے اسی طرح عورت کو بھی حاصل ہے۔

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوا ۖ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ۚ (النساء:۳۲)

جو کچھ مردوں نے کمایا اس کے مطابق ان کا حصہ ہے اور جو عورتوں نے کمایا اس کے مطابق ان کا حصہ ہے۔

عورت کو شرعی ضابطہ کے تحت ماں باپ، شوہر یا اولاد وغیرہ سے جو مال اور جائداد ملے یا وہ اپنی سعی و جہد سے جو دولت حاصل کرے اس کی وہ خود مالک ہے۔ اس میں تصرف کا اسے پورا حق حاصل ہے۔ وہ اسے اپنی آزاد مرضی سے اپنی ذات پر، شوہر اور بچوں پر، والدین اور خاندان کے دوسرے افراد پر خرچ کرسکتی ہے۔ نیک کاموں میں اسے لگا سکتی ہے۔ وہ جائداد کی خرید و فروخت اور وقف، ہبہ اور وصیت کا حق رکھتی ہے۔ اس میں مداخلت کا کوئی بھی شخص مجاز نہیں ہے۔

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو اسی کتاب کی بحث 'عورت کا معاشی مسئلہ'

عزت و آبرو کا حق

عزت و آبرو انسان کی بڑی قیمتی متاع ہے۔ اس سے کھیلنے اور اس پر دست درازی کرنے کی کسی کو اجازت نہیں دی جاسکتی۔ عورت کی عزت و آبرو پر ہمیشہ حملے ہوتے رہے ہیں اور وہ اپنی کم زوری کی وجہ سے اس کی حفاظت میں بہت زیادہ کامیاب نہیں رہی ہے۔ اس پر حملے کی دو شکلیں ہیں۔ ایک قذف اور دوسرے زنا۔ قذف یہ ہے کہ اس کے دامنِ عفت پر چھینٹے پھینکے جائیں اور اس پر بدچلنی اور بدکاری کا الزام لگایا جائے۔ اسلام کے نزدیک یہ بہت بڑا جرم اور گناہِ کبیرہ ہے۔ رسولِ کریم ﷺ نے انسان کو ہلاک کردینے والے سات گناہوں میں ایک کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔

قذف المحصنات المؤمنات الغافلات[1]	پاک دامن، ایمان والی اور بھولی بھالی عورتوں پر بدکاری کی تہمت لگانا۔

اسلام نے اس کے خلاف سخت قانونی اقدام کیا۔ وہ یہ کہ جو شخص کسی عورت پر بدکاری کی تہمت باندھے اسے اَسّی (۸۰) کوڑے لگائے جائیں اور کسی معاملہ میں اس کی شہادت نہ قبول کی جائے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً وَّلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًاۚ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ○ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَ اَصْلَحُوْاۚ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ○ (النور:۴،۵)	جو لوگ پاک دامن عورتوں پر تہمت لگائیں اور (ثبوت میں) چار گواہ نہ لائیں تو ان کو اَسّی کوڑے لگاؤ اور ان کی گواہی کبھی قبول نہ کرو، وہ خود ہی فاسق ہیں۔ سوائے ان لوگوں کے جو اس حرکت کے بعد تائب ہوجائیں اور اصلاح کرلیں۔ اللہ ضرور ان کے حق میں غفور و رحیم ہے۔

[1] مشکوٰۃ، باب الکبائر و علامات النفاق، بحوالہ بخاری و مسلم

اب زنا اور آبرو ریزی کے مسئلہ کو لیجیے۔ اسلامی قانون کے تحت کوئی شخص کسی عورت کے ساتھ زبردستی زنا کرے تو اسے اگر وہ بے شادی شدہ ہے تو سو کوڑے لگائے جائیں گے اور شادی شدہ ہے تو رجم کیا جائے گا۔ ہاں اگر عورت زنا میں بہ خوشی شریک ہو تو وہ بھی اسی سزا کی مستحق ہوگی۔[1]

تنقید و احتساب کا حق

اس میں شک نہیں کہ اسلام نے عورت کو بعض اجتماعی اور سیاسی ذمہ داریوں سے مستثنیٰ کر رکھا ہے (اس پر ہم الگ سے بحث کریں گے) لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ ان معاملات سے بالکل الگ تھلگ اور کنارہ کش رہے گی اور اسے اجتماعی نفع و نقصان سے کسی قسم کی دل چسپی نہ ہوگی۔ قرآن مجید نے مسلمان مرد اور عورت دونوں کو 'امر بالمعروف و نہی عن المنکر' کا حکم دیا ہے۔ ارشاد ہے:

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ	مومن مرد اور مومن عورتیں یہ سب ایک
اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ	دوسرے کے رفیق ہیں۔ معروف کا حکم
وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (التوبہ:۷۱)	دیتے اور منکر سے روکتے ہیں۔

امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے بڑے وسیع تقاضے ہیں۔ اس میں دعوت و تبلیغ بھی داخل ہے۔ یہ امت کی اصلاح کا بھی عمل ہے اور حکومت پر تنقید اور احتساب بھی اس میں آتا ہے۔ عورت کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے حدود میں رہتے ہوئے یہ تمام تقاضے پورے کرے۔[2]

تاریخ اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ دورِ اوّل کی خواتین اپنی اس ذمہ داری کو محسوس کرتی تھیں اور اسے پورا کرنے کی کوشش بھی کرتی تھیں۔

---

[1] ان مسائل کی تفصیلات قرآن، حدیث اور فقہ میں مل سکتی ہیں۔

[2] تفصیل کے لیے دیکھیے راقم کی کتاب 'مسلمان خواتین کی ذمہ داریاں'

اعتراضات کا جائزہ

ایک عمومی تبصرہ

عورت کے حقوق اور اس کی ذمہ داریاں کیا ہیں؟ یہ موجودہ دور کا ایک بہت ہی پیچیدہ اور نازک سوال ہے۔ اس پر اتنی بحثیں ہوچکی ہیں اور ہوتی رہتی ہیں کہ ان سب کو جمع کیا جائے تو بلا مبالغہ ایک چھوٹی سی لائبریری تیار ہوسکتی ہے، لیکن ان بحثوں سے یہ سوال حل نہیں ہوا۔ شاید یہ کہنا غلط نہ ہو کہ ان بحثوں سے اس سوال کی پیچیدگی اور نزاکت میں اضافہ ہی ہوا ہے۔ اس سوال کے جواب میں اسلام کا بھی ایک موقف ہے۔ یہ موقف دورِ جدید کے زیر اثر نہیں ہے، بلکہ اس کا یہ موقف پہلے روز سے ہے۔ کل بھی تھا، آج بھی ہے اور قیامت تک رہے گا۔ اس کا یہ موقف اُس موقف کے بالکل خلاف تھا جو صدیوں سے تسلیم شدہ تھا اور جس پر ساری دنیا میں عمل ہو رہا تھا۔ اس میں عورت کے سن و سال اور مرد سے اس کے تعلق کی نوعیت کے لحاظ سے محبت ہے، ہم دردی اور تعاون ہے، مساوات ہے، اس کی مستقل شخصیت کا اعتراف ہے، اس کی جان، مال اور عزت و آبرو کی حفاظت ہے، اس کے معاشی، معاشرتی اور سیاسی حقوق ہیں۔ اس کے ساتھ اس کی طاقت اور صلاحیت کے لحاظ سے ذمہ داریاں بھی ہیں۔ یوں کہنا چاہیے کہ اس میں اس کی شخصیت کی تکمیل کا بھرپور سامان ہے۔ یہ بہت ہی واضح، مدلّل اور مضبوط موقف ہے۔ اس سے وہ پیچیدگیاں حل ہوجاتی ہیں جو موجودہ دور کے موقف نے سماجی زندگی میں پیدا کردی ہیں۔

اسلام کے بارے میں بعض لوگوں کا رویہ غیر علمی اور جانب دارانہ ہوتا ہے، وہ اپنے مخصوص مذہبی اور سیاسی نظریات کی وجہ سے اسلام کی کسی خوبی کو تسلیم کرنا نہیں چاہتے۔ یہ لوگ عورت کے سلسلے میں اسلام کے مثبت کردار کو بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں۔ تعصب اور تنگ نظری بڑا مہلک مرض ہے۔ جو شخص اس مرض میں مبتلا ہو وہ بڑی بڑی حقیقتوں کو دیکھ نہیں پاتا اور دیکھ لیتا ہے تو ان پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتا ہے، لیکن حقیقتیں چھپائی نہیں جاسکتیں، وہ دیر سویر اپنا وجود منوا ہی لیتی ہیں۔ جب تک روئے زمین پر قرآن مجید اور حدیث کی واضح تعلیمات اور اسلام کی وہ فقہی اور قانونی بحثیں موجود ہیں جن کے مطابق صدیوں تک پوری دنیا میں فیصلے اور ان پر عمل درآمد ہوتا رہا، عورت پر اسلام کے احسانات کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اسلام سے پہلے عورت کی جو ناگفتہ بہ حالت تھی، اسلام نے اس کی ضرور اصلاح کی اور اسے بعض وہ حقوق دیے جن سے وہ پہلے محروم تھی، لیکن عورت کے ساتھ پورا انصاف نہیں کیا۔ اس نے مرد کو جو حقوق دیے وہ حقوق عورت کو نہیں دیے اور دونوں کے درمیان بہت سے معاملات میں فرق و امتیاز باقی رکھا۔ دوسرے لفظوں میں اسلام نے مرد اور عورت کو ایک حیثیت نہیں دی اور ان میں پوری طرح مساوات نہیں قائم کی۔[1]

اسلام نے عورت کو جو حقوق دیے ہیں ان پر عدم مساوات کے اس نقطۂ نظر سے بہت سے اعتراضات کیے جاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اسلام میں مرد کی برتری کا

---

[1] ہمارے ملک میں مسلم پرسنل لاء کا مسئلہ ایک زندہ مسئلہ ہے۔ پوری امت اس کے لیے فکر مند ہے اور اس کے بقا و تحفظ کی کوشش کر رہی ہے۔ پرسنل لا کا تعلق گو بہت سے شخصی و سماجی احکام سے ہے، اور اس میں مرد کے بعض حقوق بھی شامل ہیں لیکن جس مسئلہ نے اس وقت اہمیت اختیار کر لی ہے وہ عورت کے حقوق کا مسئلہ ہے۔ مخالفین کا دعویٰ ہے کہ مسلمانوں کے پرسنل لا کے تحت عورت کے ساتھ انصاف نہیں ہوا ہے اور اسے پورے حقوق حاصل نہیں ہیں۔ چناں چہ قدم قدم پر عورت کی مظلومی کی دہائی دی جاتی ہے اور پرسنل لاء میں ترمیم اور تبدیلی کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔

تصور ہے، مرد گھر کا حاکم اور فرماں روا ہے، وہ ایک سے زیادہ شادیاں کرسکتا ہے، اسے طلاق کا حق حاصل ہے، وراثت میں عورت کا حصہ آدھا ہے، شہادت، قصاص اور دیت کے قانون میں اس کے ساتھ ناانصافی ہوئی ہے۔ یہ اور اس طرح کے اور بھی اعتراضات ہیں۔ اعتراض کرنے والے چاہتے ہیں کہ ان قوانین کو بدل دیا جائے۔ مرد کی برتری ختم کردی جائے، عورت کو خانگی زندگی میں وہ سارے حقوق دیے جائیں جو مرد کو حاصل ہیں، دونوں کو برابر کے اختیارات ہوں، وراثت میں عورت کا حصہ وہی رہے جو مرد کا ہے، طلاق کا حق عورت کو بھی حاصل ہو، وہ جب چاہے مرد سے علیحدگی حاصل کرسکے، مرد طلاق دے تو مطلقہ کا اس کی زندگی بھر نفقہ برداشت کرے، مرد کو ایک بیوی کی موجودگی میں دوسری شادی کی اجازت نہ ہو، بعض اوقات یہ کہنے میں بھی تامل نہیں ہوتا کہ مرد کو ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کی اجازت ہو تو عورت کو بھی یہ حق ملنا چاہیے کہ ایک سے زیادہ مردوں سے تعلق رکھے۔ اس طرح عورت کو وہ تمام سیاسی وسماجی حقوق دیے جائیں جو مرد کو حاصل ہیں۔ یہ سارے اعتراضات اسلامی تعلیمات سے ناواقفیت کا نتیجہ ہیں۔ افسوس ہے کہ اس ناواقفیت میں بہت سے پڑھے لکھے لوگ اور دانش ور بھی گرفتار ہیں۔ اسلام نے زندگی کا جو وسیع اور جامع تصور دیا ہے اور جس طرح شخصی اور اجتماعی زندگی کی تعمیر کی ہے اس کی روشنی میں یہ اعتراضات خود بہ خود رفع ہوجاتے ہیں۔

یہ اعتراضات نئے بالکل نہیں ہیں۔ ان کی عمر کافی ہوچکی ہے۔ اس مدت میں مختلف پہلوؤں سے ان کے جوابات بھی دیے جاتے رہے ہیں۔ لیکن یہ بات کس قدر افسوس ناک اور علمی دیانت کے خلاف ہے کہ ان اعتراضات کو اس طرح دہرایا جاتا ہے کہ جیسے پہلی بار انھیں دنیا کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے اور ان کا کوئی جواب مسلمان مفکرین کے پاس نہیں ہے۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ شاید اس کے پیچھے اسلام کو سمجھنے کا جذبہ کم ہے اور زیادہ دلچسپی اسے ہدف تنقید بنانے سے ہے، حالاں کہ ہونا یہ چاہیے کہ جن اعتراضات کا جواب دیا جائے اس پر سنجیدگی سے غور کیا جائے اور اس میں کوئی خامی

ہوتو اسے واضح کیا جائے۔ اس سے افہام وتفہیم کی راہیں کھلیں گی، غلط فہمیاں رفع ہوں گی اور اسلام کو صحیح شکل میں سمجھا جاسکے گا۔

یہ سارے اعتراضات وہ لوگ کرتے ہیں جن کے ذہنوں پر مساواتِ مرد وزن کا وہ غیر معتدل نظریہ چھایا ہوا ہے جسے مغرب نے پیش کیا ہے اور جس کے چنگل میں وہ خود بری طرح پھنسا ہوا ہے۔ یہ نظریہ اب محض نظریہ نہیں رہا بلکہ اس کا طویل تجربہ ہوچکا ہے اور جنسی آوارگی اور خاندان کی بربادی کی شکل میں اس کے بھیانک نتائج سامنے آچکے ہیں[1] لیکن ان نتائج سے صرف نظر کرکے اس کی وکالت اس طرح کی جاتی ہے کہ وہ نہ صرف یہ کہ ایک بے ضرر نظریہ ہے بلکہ عورت کی نجات اور کامیابی اسی سے وابستہ ہے۔ اگر اسلام اس کا ساتھ نہ دے تو عقل کا تقاضا ہے کہ اسے خیر باد کہہ دیا جائے۔ حالاں کہ عورت کے بارے میں اسلام کے نظریہ کی قدر و قیمت، افادیت اور پاکیزگی، تاریخ کے تجربے سے ثابت ہوچکی ہے۔ جب بھی مغرب کے مساواتِ مرد و زن کے تصور کی اصلاح کی جائے گی اور اس کی بے اعتدالیوں کو دور کیا جائے گا وہ اسلام کے نظریہ سے قریب ہوگا۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ اسلام ہی کے ذریعہ اس کی اصلاح ہوسکتی ہے اور اس کی خامیاں دور کی جاسکتی ہیں۔

عورت کے بارے میں اسلام کے موقف پر اس کے مخالفین کی طرف سے اعتراضات اتنی شدت کے ساتھ ہوتے رہے ہیں اور مسلسل ہو رہے ہیں کہ بہت سے اسلام کا نام لینے والے بھی ان سے متاثر اور مرعوب ہیں۔ اور انھیں اسلام کی تعلیمات میں بڑی خامیاں نظر آتی ہیں۔

اس مرعوبیت کے بھی مختلف درجات ہیں۔ ان سب کا تعین آسان نہیں ہے۔ بعض حضرات، چاہے وہ زبان سے اس کا اقرار کریں یا نہ کریں لیکن عملاً اسلام کے ان 'فرسودہ' اور 'ناقابلِ عمل' قوانین ہی سے جان چھڑانا چاہتے ہیں۔ ان کے نزدیک آج کے

---

[1] اس کی تفصیل 'آزادیٔ نسواں کا مغربی تصور' کے عنوان کے تحت گزر چکی ہے۔

دور میں عورت کی منزل اسلام نے نہیں مغرب نے متعین کی ہے۔ وہ اسلام کے ''حصار'' میں رہ کر ترقی نہیں کرسکتی۔ اس کے لیے اسے ان مرغ زاروں میں دوڑ لگانی ہوگی جو مغرب کی رہ نمائی میں تیار ہوئے ہیں، ان کی اس خواہش اور کوشش کا ایک مسلمان اس وقت تک ساتھ نہیں دے سکتا جب تک کہ وہ مسلمان ہے۔ اس کے لیے احکام شریعت وہ 'حدود' ہیں جن سے تجاوز کی اسے اجازت نہیں ہے۔ اگر کبھی اس سے یہ غلطی سرزد ہوجائے تو وہ اپنے آپ کو مجرم اور خدا کے سامنے جواب دہ تصور کرے گا اور جلد سے جلد ان 'حدود' کے اندر آنے کی کوشش کرے گا۔ یہ اس کے ایمان کا تقاضا ہے۔ اس وقت تمام احکام شریعت زیر بحث نہیں ہیں۔ صرف ان احکام کا ذکر ہے جو خاندانی زندگی سے متعلق ہیں۔ ان احکام کو قرآن مجید نے متعدد مقامات پر 'حدود اللہ' سے تعبیر کیا ہے اور ان 'حدود' کو توڑنے سے سختی سے منع فرمایا ہے۔ ایک جگہ قانونِ طلاق کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

تِلْکَ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا ۚ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ○ (البقرہ:۲۲۹)

یہ اللہ کے قائم کردہ حدود ہیں۔ ان سے آگے نہ بڑھو جو لوگ ان سے آگے بڑھیں وہی ظالم ہیں۔

سورۂ طلاق میں بھی احکام طلاق بیان ہوئے ہیں۔ اس کے فوراً بعد ارشاد ہے۔

وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ عَتَتْ عَنْ اَمْرِ رَبِّهَا وَرُسُلِهٖ فَحَاسَبْنٰهَا حِسَابًا شَدِيْدًا وَّ عَذَّبْنٰهَا عَذَابًا نُّكْرًا ○ فَذَاقَتْ وَبَالَ اَمْرِهَا وَكَانَ عَاقِبَةُ اَمْرِهَا خُسْرًا ○ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ۙ فَاتَّقُوا اللّٰهَ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ ۚ ۵ۛ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ قَدْ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكُمْ ذِكْرًا ○ (الطلاق:۸-۱۰)

کتنی ہی بستیاں ہیں جنھوں نے اپنے رب کی اور اس کے رسولوں کے حکم کی نافرمانی کی تو ہم نے ان سے سخت حساب لیا اور انھیں بری طرح عذاب دیا۔ انھوں نے اپنے اعمال کا مزا چکھا اور انجام کار وہ نقصان میں رہے۔ اللہ نے آخرت میں ان کے لیے سخت عذاب تیار کررکھا ہے۔ لہٰذا اے عقل والو، جو ایمان لائے ہو، اللہ سے ڈرو۔ بے شک اللہ نے تمہاری طرف ایک نصیحت نازل کی ہے۔

کیا کوئی مسلمان اس تہدید و تنبیہ کے بعد عورت کے حقوق یا عائلی قوانین یا کسی بھی قانونِ شریعت کی مخالفت کا تصور کرسکتا ہے؟

بعض حضرات کے دل و دماغ پر مغرب کا اتنا غلبہ تو نہیں ہے کہ وہ قرآنی احکام کو دفترِ پارینہ سمجھ کر رد کردیں لیکن وہ سمجھتے ہیں کہ اسلامی شریعت جن حالات میں نازل ہوئی تھی وہ حالات بدل چکے ہیں۔ بدلے ہوئے حالات میں صدیوں پرانے اصول و قوانین اور روایات پر اصرار صحیح نہیں ہے۔ یہ دور مسابقت کا دور ہے۔ اسلام نے عورت کے بارے میں جو موقف اختیار کیا ہے اس پر قائم رہتے ہوئے موجودہ مسابقت میں وہ شریک نہیں ہوسکتی۔ اس کے پیچھے رہ جانے کا مطلب یہ ہے کہ پوری قوم پیچھے رہ جائے، اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ اسلامی قوانین میں ترمیم کرکے انھیں موجودہ دور سے ہم آہنگ کرلیا جائے۔ ان حضرات کے نزدیک یہ 'اجتہاد' ہے اور بدلے ہوئے حالات میں اجتہاد ضروری ہے۔ جو لوگ اس طرح کا 'اجتہاد' نہیں کرتے انھیں آئے دن ان حضرات کی طرف سے، حالات سے بے خبر، قدامت پرست اور جمود زدہ ہونے کے طعنے سننے پڑتے ہیں۔

بعض لوگ اس سے بھی آگے بڑھ کر بڑی سادگی اور بھولے پن سے کہتے ہیں کہ اسلام ایک جدید (Modren) مذہب ہے۔ اس نے عورت کو دورِ جدید کے سارے حقوق دیے ہیں۔ لیکن قدامت پرستوں نے قرآن و حدیث کی تعبیر اس طرح کی ہے کہ دورِ غلامی کی یاد تازہ ہوجاتی ہے۔ اس لیے اسلام کی جدید اور ترقی پسندانہ تعبیر کی ضرورت ہے۔ کون ہے جو اس فہم و بصیرت اور روشن خیالی کی داد نہ دے؟

جو لوگ 'اجتہاد' کے نام پر اسلامی قانون میں ترمیم چاہتے ہیں وہ غالباً اسلامی قانون کو بھی انسانی قوانین پر قیاس کرتے ہیں۔ جو قانون انسان بناتا ہے اسے وہ جب چاہے اور جس طرح چاہے بدل سکتا ہے۔ اسلامی قانون کسی انسان کا بنایا ہوا نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ ہے، اس لیے اس میں کسی بھی فرد کو ترمیم و تبدیلی کا حق نہیں ہے،

یہ حق اس نے اس پیغمبر کو بھی نہیں دیا جس پر شریعت کا نزول ہوا۔

وَ اِذَا تُتْلٰی عَلَیْهِمْ اٰیَاتُنَا بَیِّنٰتٍ ۙ قَالَ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَآءَ نَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَیْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ ؕ قُلْ مَا یَكُوْنُ لِیْۤ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِیْ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰۤی اِلَیَّ ۚ اِنِّیْۤ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ ○ (یونس:۱۵)

جب انھیں ہماری واضح آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو وہ لوگ جنھیں ہم سے ملاقات کی توقع نہیں ہے، کہتے ہیں کہ اس کی جگہ کوئی دوسرا قرآن لے آؤ یا اس میں ترمیم کردو۔ ان سے کہہ دو کہ یہ میرا کام نہیں کہ میں اس میں اپنی طرف سے کوئی ترمیم کردوں۔ میں تو اس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر کی جاتی ہے۔ اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو مجھے ایک بڑے دن کے عذاب کا ڈر ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ انسانی قوانین وقت اور حالات کی پیداوار ہوتے ہیں۔ یہ زمان و مکان کے اثرات سے آزاد نہیں ہوتے۔ ان میں بڑی لچک ہوتی ہے۔ وہ حالات کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ انسانی قانون میں اس لچک کا نہ پایا جانا اس کی خوبی نہیں، خامی ہے، جو اسے بدلے ہوئے حالات میں ناقابل عمل بنا دیتی ہے۔ لیکن جس شخص نے بھی اسلام کا کھلے ذہن سے تھوڑا بہت مطالعہ کیا ہے وہ اس حقیقت سے انکار نہیں کرسکتا کہ قرآن نے خود کو ایک ابدی دین کی حیثیت سے پیش کیا ہے جس میں تا قیامت کوئی تبدیلی نہیں آسکتی۔ اجتہاد ایک دوسری ہی چیز ہے۔ وہ قرآن کے صریح احکام کو بدل دینے کا نام نہیں ہے، بلکہ ان احکام کو حالات پر منطبق کرنے اور ان کی روشنی میں نئے احکام دریافت کرنے کا نام ہے۔ یہ کام بے قید اور آزاد فکر کے ساتھ نہیں ہوسکتا بلکہ اسے ان حدود کا پابند ہونا پڑے گا جو اسلام نے وضع کیے ہیں۔

یہاں ایک سوال بار بار ذہن میں اُبھرتا ہے۔ وہ یہ کہ آخر ان 'مصلحین' (Reformists) کو عورت کے حقوق اور مسلمانوں کی معاشرتی اصلاح کی فکر اس قدر

دامن گیر کیوں ہے؟ مسلمانوں میں بہت سی خرابیاں ہیں۔ عقیدے کی بھی، عمل کی بھی، اخلاق کی بھی، لین دین اور معاملات کی بھی، لیکن وہ مسلمان عورت کی مظلومی پر جس قدر فکرمند اور پریشان ہیں اتنے فکرمند اور پریشان کسی اور مسئلہ میں نظر نہیں آتے؟

ان حضرات کے ذہن وفکر کے مطالعہ سے اس کی وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ ان کے نزدیک انسان کی زندگی کا مقصد اور اس کی منزل وہ ہے اور وہی ہونی چاہیے جو مغرب نے متعین کردی ہے۔ اس کے لیے راستہ بھی انھوں نے وہی اختیار کیا ہے جو مغرب نے اختیار کیا ہے۔ اس کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ دین و مذہب ایک بے معنی چیز ہے، اس کا ہماری زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہے، اگر کسی کو اس سے دلچسپی ہو تو اپنی شخصی زندگی میں اس سے دلچسپی رکھے، اجتماعی زندگی کو اس سے بہرحال آزاد ہونا چاہیے۔ جب تک انسان مذہب کی بندشوں میں جکڑا ہوا ہے، ماضی کے دورِ ظلمت میں پڑا رہے گا اور ترقی کی راہیں اس کے لیے بند ہوں گی۔ آج کے دور میں اسے جینے کا حق نہیں ہے۔

یہ پوری مسلمان امت کو اسی راہ پر لے چلنا چاہتے ہیں۔ اس کے لیے پہلے قدم کے طور پر شاید وہ 'معاشرتی اصلاح' کو زیادہ سود مند خیال کرتے ہیں اور مسلمان عورت کے حقوق کی دہائی دے کر انھیں اس میدان میں کامیابی کی غالباً زیادہ توقع بھی ہے۔ اس لیے کہ جب تک مسلمان عورت دین کے قدیم تصورات کی ''دلدل'' میں پھنسی ہوئی ہے اور نئی نسل کو خدا اور رسول کی وفاداری اور ان کے احکام کی اتباع کا درس دے رہی ہے، اس وقت تک دین کی بندشیں اتنی ڈھیلی نہیں ہوں گی کہ امت مسلمہ کو اس کی ہزار بے عملی کے باوجود اس سے پھیرا جاسکے۔ ان کا رخ اسی وقت بدلے گا جب کہ عورت دین سے منہ پھیر لے اور اپنے حقوق حاصل کرنے کے لیے اس کے خلاف علم اٹھالے۔ اس میں چوں کہ وہ کامیاب نہیں ہیں اور انھیں کامیابی کی توقع بھی نہیں رکھنی چاہیے، اس لیے غم وغصہ مذہب کے علم برداروں پر اتارتے رہتے ہیں اور انھیں دقیانوسی، قدامت پرست، احیاء پسند اور بنیاد پرست جیسے الفاظ اور القاب سے نوازتے رہتے

ہیں۔ ان کی زبان اور قلم سے نکلا ہوا ہر لفظ سند ہے اور دورِ جدید نے اسے وسیع پیمانے پر پھیلانے کا انتظام بھی رکھا ہے، اس لیے یہ ساری کوشش ترقی اور تہذیب و شائستگی کے نام پر بڑی بے تکلفی کے ساتھ پھیلائی جا رہی ہے۔

بعض حضرات بذات خود دینی مزاج کے حامل ہیں اور مغربی تہذیب کے تلخ تجربات سے بچنا بھی چاہتے ہیں۔ لیکن چاروں طرف سے اس تہذیب کا دباؤ اتنا سخت ہے کہ وہ اس کے اثرات سے آزاد نہیں ہیں۔ آہستہ آہستہ ان کی معاشرت میں تبدیلی آرہی ہے اور عملاً مغربی تہذیب کی گرفت ان پر مضبوط ہوتی جا رہی ہے لیکن ابھی وہ اس پہلو سے خوش اور مطمئن نظر آتے ہیں کہ مغرب کی تقلید کی دوڑ میں شریک ہونے کے باوجود اس کی خرابیوں سے ان کی معاشرت محفوظ ہے اور آئندہ بھی اسی طرح محفوظ رہے گی۔ لیکن یہ جھوٹا اطمینان اور ایک طرح کی خوش فہمی ہے جو زیادہ دنوں تک باقی نہیں رہ سکتی۔ اگر ابھی تک مغرب کے کڑوے کسیلے پھل انھیں حلق سے نہیں اتارنے پڑرہے ہیں تو اس کی وجہ اسلام کے وہ اثرات ہیں جو اس تہذیب کے ثمرات کو ظاہر نہیں ہونے دے رہے ہیں۔ جب یہ اثرات ختم ہوں گے تو مغربی تہذیب اپنی تمام خرابیوں کے ساتھ ان کے گھروں میں موجود ہوگی۔ سیلاب کے آثار کو دیکھ کر جو شخص ہوش میں نہ آئے اور اپنے گھر کی حفاظت نہ کرے اس کا گھر سیلاب کی نذر ہو کر رہے گا۔ کوئی اسے بچا نہیں سکتا۔

اب ہم ان موٹے موٹے اعتراضات کا کسی قدر تفصیل سے جائزہ لیں گے جو عورت کے حقوق پر کیے جاتے ہیں۔

مرد کی حکومت

اسلام نے ازدواجی زندگی کے ہر پہلو پر تفصیل سے بحث کی ہے اور خاندان کا ایک وسیع اور جامع نقشہ پیش کیا ہے۔ اس پر ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ اس میں مرد کو غیر معمولی حقوق اور اختیارات دیے گئے ہیں اور عورت کی آزادی سلب کرلی گئی ہے۔ مرد صاحبِ اقتدار اور حاکم ہے اور عورت زیر دست اور محکوم۔ مرد جس طرح چاہے اس پر حکومت کرسکتا ہے۔ جب تک وہ رشتۂ ازدواج میں بندھی ہوئی ہے، اس کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھا سکتی۔

یہ تصویر جتنی بھیانک ہے اتنی ہی حقیقت سے دور ہے۔ اس میں اسلام کی تعلیمات کو سمجھنے کی شاید اتنی کوشش نہیں کی گئی ہے جتنی کہ انھیں مسخ کرنے اور بگاڑنے کی کوشش کی گئی ہے۔

میاں بیوی کا تعلق اُلفت و محبت کا تعلق ہے

سب سے پہلے اس مسئلہ کے دینی اور اخلاقی پہلو کو لیجیے۔ یہی اسلام کے خاندانی نظام میں بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ اسلام کے نزدیک میاں بیوی کا تعلق اصلاً الفت و محبت کا تعلق ہے، جس میں دونوں ایک دوسرے کو خوش رکھنے، اس کی ضروریات پوری کرنے اور اسے سکون اور راحت پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ قرآن مجید نے اس

محبت کو قدرت کی نشانیوں میں سے ایک بڑی نشانی قرار دیا ہے۔ ارشاد ہے۔

وَ مِنْ اٰیٰتِہٖۤ اَنْ خَلَقَ لَکُمْ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْکُنُوْۤا اِلَیْھَا وَجَعَلَ بَیْنَکُمْ مَّوَدَّۃً وَّرَحْمَۃً ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ ○ (الروم:۲۱)

اس کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ اس نے تمہارے لیے تمہاری ہی جنس سے جوڑے بنائے تاکہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو۔ اور تمہارے درمیان محبت اور رحمت پیدا کردی۔ یقیناً اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور وفکر کرتے ہیں۔

ایک دوسرے مقام پر میاں بیوی کو ایک دوسرے کا لباس کہا گیا ہے۔ 'ھُنَّ لِبَاسٌ لَّکُمْ وَ اَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّھُنَّ' (البقرہ:۱۸۷) اس تعبیر میں بڑی ہی معنویت ہے۔ لباس کی بعض خصوصیات ہیں۔ قرآن مجید، یہی خصوصیات میاں بیوی کے درمیان دیکھنا چاہتا ہے۔ لباس کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ جسم سے چپکا رہتا ہے۔ اس کے اور جسم کے درمیان کوئی چیز حائل نہیں ہوتی۔ یہی کیفیت میاں بیوی کے تعلق کی ہے۔ مادّی تعلقات کی اس دنیا میں بعض پہلوؤں سے جو قربت اس تعلق میں ہے وہ کسی دوسرے تعلق میں نہیں پائی جاتی۔ لباس کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ آدمی کو موسم کی سختیوں اور گرمی سردی سے بچاتا ہے۔ میاں بیوی کا رشتہ بھی یہ چاہتا ہے کہ ان میں سے ایک کسی مشکل اور دشواری سے دوچار ہو تو اس سے نکلنے میں دوسرا مدد کرے، زندگی کو کسی بھی مرحلہ میں ناگوار نہ ہونے دے، جہاں تک ممکن ہو اسے سکون اور راحت فراہم کرے۔ لباس کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ پردہ پوش ہے۔ انسان کے جسم کے جو حصے قابلِ ستر ہیں اور جن کے عریاں ہونے سے وہ عار اور شرم محسوس کرتا ہے وہ لباس سے ڈھکے رہتے ہیں۔ یہی کیفیت خاوند اور بیوی کی ہونی چاہیے۔ وہ کبھی اس بات کو گوارا نہ کریں کہ اپنے رفیقِ حیات کے عیوب دنیا کے سامنے کھل جائیں اور وہ نادم و شرم سار ہو۔ لباس کی چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ وہ وجہِ زینت ہے۔ اسی طرح عورت کی زینت مرد سے اور م

کی زینت عورت سے ہے۔ ازدواجی تعلقات کی بہتری ہی سے دنیا کی رونق قائم ہے۔ اس کے بغیر یہ رونق ماند پڑ جاتی اور زندگی بے کیف ہوکر رہ جاتی ہے۔ اس طرح کی نہ جانے کتنی ہی لطیف حقیقتوں کی طرف یہ تعبیر اشارہ کر رہی ہے۔

میاں بیوی کے درمیان جو تعلق مطلوب ہے، احادیث میں زیادہ وضاحت کے ساتھ اسے بیان کیا گیا ہے۔ ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے نیک اور صالح بیوی کی تعریف اس طرح کی ہے۔

التی تسره اذا نظر و تطیعه اذا امر ولا تخالفه فی مایکره فی نفسها و ماله[1]	جب شوہر اسے دیکھے تو خوش کردے، کوئی بات کہے تو مان لے اور اپنے نفس اور شوہر کے مال میں جس تصرف کو وہ ناپسند کرے اس کا ارتکاب کرکے اس کی مخالفت نہ کرے۔

اسی طرح حدیث میں با اخلاق شوہر کو بہترین انسان کہا گیا ہے۔ حضرت عائشہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

خیرکم خیرکم لاهله و انا خیرکم لاهلی[2]	تم میں بہتر شخص وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے حق میں بہتر ہو اور میں بھی اپنے گھر والوں کے لیے بہتر ہوں۔

اس مضمون کی بہت سی حدیثیں مروی ہیں[3] ان حدیثوں میں جو معیار بیان کیا گیا ہے اس پر اگر میاں بیوی اترنے کی کوشش کریں تو خاندان سکون کا مرکز ہوگا اور ایک مثالی معاشرہ کی بہ آسانی تعمیر ہوسکے گی۔

مرد خاندان کا سربراہ کیوں ہے؟

اب بہ راہِ راست مرد کی سربراہی کے مسئلہ کو لیجیے۔ دنیا کے ہر چھوٹے بڑے

---

[1] مسند احمد: ۲/۲۵۱۔ نسائی، کتاب النکاح، ای النساء خیر

[2] ترمذی، ابواب المناقب، باب فضل ازواج النبیؐ۔ ابن ماجہ کتاب النکاح باب حسن معاشرۃ النساء۔

[3] ملاحظہ ہو راقم کی کتاب۔ عورت اور اسلام: ص۲۲-۲۴

ادارے کو ایک سربراہ اور نگراں کی ضرورت ہوتی ہے جو اس کے نظم و ضبط کو درست رکھے اور اسے ٹھیک ٹھیک چلائے۔ اس کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ ادارے کے مفاد کو مقدم رکھے، اس کے افراد کے حقوق پہچانے اور ان کے ساتھ محبت و ہم دردی کا سلوک کرے۔ ادارہ کے افراد کے لیے بھی ضروری ہے کہ خوش دِلی سے اس کی اطاعت کریں، جب تک ادارے کا مفاد اس کے پیش نظر ہے، اس کے احکام سے سرکشی اور بغاوت نہ کریں اور آپس کے اختلاف میں اس کے حکم اور فیصلے کو آخری اور قطعی حیثیت دیں۔ سربراہی کا یہ مقام کسی ایک ہی فرد کو حاصل ہوسکتا ہے۔ اگر ایک سے زیادہ افراد اس کے حامل ہوں اور سب اپنی آزاد مرضی چلانا چاہیں تو ادارہ کا نظم لازماً درہم برہم ہوکر رہ جائے گا۔ خاندان بھی ایک ادارہ ہے اور بڑا پیچیدہ ادارہ ہے۔ اس کا نظم ونسق اسی وقت برقرار رہ سکتا ہے جب کہ اس کی سربراہی کسی ایک فرد کے ہاتھ میں ہو۔ اگر اس کے ساتھ دوسرے فرد کو بھی یہی حیثیت دے دی جائے تو اس کا نظم چل نہیں سکتا، بلکہ اس کے وجود کا باقی رہنا بھی دشوار ہے۔ سوال صرف یہ ہے کہ خاندان کا سربراہ مرد ہو یا عورت؟ اس کا جواب قرآن نے اس آیت میں دیا ہے:

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰی بَعْضٍ وَّ بِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ط (النساء:۳۴)

مرد قوّام ہیں عورتوں پر، اس وجہ سے کہ اللہ نے ان میں سے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے اور اس وجہ سے کہ مرد اپنا مال خرچ کرتے ہیں۔

اس میں مرد کو خاندان کا سربراہ مقرر کرنے کی دو وجہیں بیان کی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ اسے عورت کے مقابلے میں فضیلت اور برتری حاصل ہے، دوسرے یہ کہ وہ اپنا مال خرچ کرتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خاندان کی سربراہی کے لیے مرد کا انتخاب قرآن نے کسی تعصب کی بنا پر نہیں بلکہ اس کی صلاحیت اور مالی ذمہ داریوں کی وجہ سے کیا ہے۔ اب آیئے ان دونوں باتوں پر ذرا سنجیدگی سے غور کیا جائے۔

مرد زیادہ قوت و طاقت رکھتا ہے

عورت اور مرد کی جسمانی اور ذہنی ساخت بتاتی ہے کہ خاندان کا بوجھ اُٹھانے کے لیے جن قوتوں اور صلاحیتوں کی ضرورت ہے وہ عورت کی بہ نسبت مرد میں زیادہ ہیں۔ وہ معاش کے لیے زیادہ دوڑ دھوپ کرسکتا ہے، کھیتی باڑی، صنعت و حرفت اور دوسرے میدانوں میں مشکل اور محنت طلب کام کرسکتا ہے، زندگی کے شدائد کا مقابلہ کرنے اور ان سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت بھی اس کی بڑھی ہوئی ہے، بلکہ یہ حیرت انگیز حقیقت بھی دیکھی جاسکتی ہے کہ جو کام خاص عورت کے سمجھے جاتے ہیں اور جن میں وہ شاید مدتِ دراز سے لگی ہوئی ہے ان میں بھی مرد زیادہ قوت و صلاحیت کا مظاہرہ کرتا ہے، جیسے طبّاخی (کھانا پکانا) خیّاطی (سینا پرونا) وغیرہ۔ عورت کا سینہ لطیف جذبات اور نازک احساسات کا مرکز ہے، وہ واقعاتِ مسرت اور حادثاتِ غم دونوں سے مرد سے کہیں زیادہ متاثر ہوتی ہے۔ اس لیے خیال ہوتا ہے کہ اسے ان کے اظہار میں مرد کے مقابلہ میں زیادہ کامیاب ہونا چاہیے لیکن یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ادب، شاعری، آرٹ اور فنون لطیفہ کے ذریعہ ان کیفیات کے بیان کرنے میں مرد جتنا کامیاب رہا، عورت اتنی کامیابی نہیں حاصل کرسکی۔ فنون لطیفہ کے سبھی شعبوں پر مرد کی حکمرانی رہی۔ کہا جاسکتا ہے کہ ان تمام شعبوں پر بھی مرد کا قبضہ رہا اور عورت کو ان میں آگے بڑھنے اور اپنی صلاحیتوں کو ظاہر کرنے کا موقع نہیں ملا، لیکن اس جواب سے ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے، وہ یہ کہ ان تمام شعبوں پر مرد کا قبضہ کیسے ہوگیا اور عورت اس کشمکش میں کیسے پیچھے رہ گئی؟ اس لیے یہ بہرحال ماننا پڑے گا کہ مرد ہر میدان میں اپنی صلاحیت اور توانائی کا زیادہ ثبوت دے سکتا ہے اور دیا ہے۔

جب تجربہ اس بات کی شہادت دے رہا ہے کہ مرد کے اندر زیادہ قوت اور صلاحیت ہے تو فطری طور پر اسی کو خاندان کا سربراہ بھی ہونا چاہیے۔ مرد کی برتری کا

اعتراف نہ کرنا اور عورت اور مرد کو ہر پہلو سے مساوی ثابت کرنا ایک طرح کا ردعمل یا تعصب ہے جو بحث و مباحثہ میں تو شاید کچھ چل جائے لیکن کارزارِ حیات میں زیادہ دور تک انسان کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ یہاں بہت جلد حقیقت تسلیم کرنی پڑتی ہے۔

مالی بوجھ برداشت کرتا ہے

اب مرد کی مالی ذمہ داریوں کو لیجیے۔ اسلامی قانون کے تحت مرد پر عورت کا مہر، اس کا نان ونفقہ اور اس کے لیے رہائش اور سکونت کا نظم کرنا واجب ہے۔ اس کے ساتھ حسبِ ضرورت اس پر عورت کی تعلیم و تربیت، دینی و اخلاقی نگرانی اور اس کی جان، مال اور عزت وآبرو کی حفاظت کی ذمہ داری بھی عائد ہوتی ہے۔

مرد یہ ساری ذمہ داری اس لیے قبول کرتا ہے کہ عورت اس کی نگرانی میں اس کے گھر کا نظم چلائے گی، اسے سکون فراہم کرے گی، اس کے بچوں کی نگہ داشت اور تربیت کرے گی، اور ایک بہتر خاندان کی تعمیر میں مدد دے گی۔

ان نوع بہ نوع مالی اور انتظامی ذمہ داریوں کو ٹھیک ادا کرنے کے لیے مرد کو بعض حقوق و اختیارات بھی دیے گئے ہیں۔ لیکن یہ حقوق اور اختیارات مطلق اور غیر محدود نہیں ہیں، بلکہ ان کے کچھ حدود متعین ہیں۔ آدمی ان حدود کے اندر ہی اپنے اختیارات کو استعمال کرسکتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ عملی زندگی میں اس بات کا امکان بہرحال ہے کہ مرد اُن حدود سے تجاوز کرکے، جن کا اسلام نے اسے پابند بنایا ہے، اپنے اختیارات کا غلط استعمال کرے اور عورت کے ساتھ زیادتی ہونے لگے۔ اسلام اس امکان کو نظر انداز نہیں کرتا۔ اس صورت میں عورت قانونی چارہ جوئی کرکے مرد کو ان حدود کی پابندی پر مجبور کرسکتی ہے۔ ناگزیر حالات میں وہ شوہر سے خلع یا علیٰحدگی بھی حاصل کرسکتی ہے۔

کیا عورت خاندان کی سربراہ ہوسکتی ہے؟

بعض لوگ عورت کی حمایت میں چاہتے ہیں کہ مرد کو خانگی زندگی میں جو حقوق

اور اختیارات حاصل ہیں وہ سب اس سے چھین لیے جائیں۔ لیکن اگر یہ حقوق و اختیارات اس سے سلب کر لیے جائیں تو یہ توقع بھی اس سے نہیں کی جانی چاہیے کہ وہ ان ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھائے گا جو سربراہِ خاندان کی حیثیت سے اس پر عائد ہوتی ہیں۔ اس لیے جو صورت ممکن ہے وہ یہ کہ مرد کی جگہ عورت کو خاندان کا سربراہ اور حاکم مان لیا جائے۔ اسے وہ تمام حقوق و اختیارات بھی دے دیے جائیں جو مرد کو حاصل ہیں اور مرد کی ساری ذمہ داریاں بھی اس پر ڈال دی جائیں۔ جب تک عورت ان ذمہ داریوں کو نہ اٹھائے ظاہر ہے اس کی سربراہی کا کوئی جواز نہیں ہے۔

کہا جاتا ہے کہ عورت کے نان ونفقہ اور اخراجات کا اب کوئی مسئلہ نہیں رہا، اس لیے کہ عورت کمانے لگی ہے اور معاشی طور پر آزاد ہے۔ لیکن اس سے قطع نظر کہ ایسی عورتوں کا تناسب آج بھی بہت کم ہے جو معاشی طور پر خود کفیل ہوں۔ مسئلہ صرف عورت کی روزی روٹی ہی کا نہیں، بچوں کی معاش، ان کی نگہ داشت، تعلیم و تربیت، شادی بیاہ اور خاندان کے دوسرے افراد کے مختلف مسائل اور ان کی ذمہ داریوں کا بھی ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا عورت اپنا معاشی بوجھ برداشت کرنے کے ساتھ سربراہِ خاندان کی حیثیت سے ان مسائل سے نمٹنے اور ذمہ داریوں کو اٹھانے کے لیے تیار ہے؟

اس میں شک نہیں کہ دنیا میں ہمیشہ ایسی عورتیں رہی ہیں جن کی معاشی حیثیت بھی مضبوط تھی اور خاندان کا نظم بھی بہتر طریقہ سے چلا سکتی تھیں، ایسی عورتیں آج بھی ہیں اور آئندہ بھی ہوں گی۔ بحث ان معدودے چند عورتوں کی نہیں پوری صنفِ نازک کی ہے۔ بظاہر وہ اپنے خیر خواہوں کے مشورے اور تائید کے باوجود نہ تو اپنے نان ونفقہ کے حق سے دست بردار ہونے کے لیے تیار ہے اور نہ اس کے لیے آمادہ ہے کہ خاندان کا بوجھ شوہر کے سر سے اتار کر اپنے سر پر رکھ لے۔

حجاب کی بندشیں کیوں؟

احکام حجاب

قرآن مجید میں عورت کے حجاب سے متعلق احکام متعدد مقامات پر بیان ہوئے ہیں۔ ان کا سیاق وسباق گومختلف ہے لیکن وہ اپنے مفہوم و مدعا اور غرض و غایت میں واضح ہیں۔ ان سے اسلام کا مزاج اور رجحان ہی نہیں اس کا موقف بھی آسانی سے سمجھا جاسکتا ہے۔

اجنبیوں سے گفتگو کے آداب

رسول اللہ ﷺ کی ازواجِ مطہرات امت کی مائیں ہیں (الاحزاب:٦) ان کی زندگی امت کے لیے نمونہ ہے۔ ان سے خطاب ہے۔

يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَيْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِيْ فِيْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ وَّ قُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا (الاحزاب:٣٢)	اے نبی کی بیویو! تم عام عورتوں کی طرح نہ ہو اگر تم تقویٰ اختیار کرو۔ لہٰذا تم نرم لہجہ میں بات نہ کرو کہ جس کے دل میں کوئی روگ ہے وہ کوئی طمع کرنے لگے اور معروف بات کہو۔

اس آیت میں ازواجِ مطہرات کو اجنبی مردوں سے بات کرنے کا طریقہ بتایا گیا ہے۔ اس سلسلے میں دو ہدایات دی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ کسی سے بات ہو تو انداز میں

لوچ اور کشش نہ ہو بلکہ ایک طرح کی سختی ہو، ورنہ کسی بھی بد باطن کے دل میں برے خیالات آسکتے ہیں۔ دوسری ہدایت یہ دی گئی کہ جو بات ہو وہ معروف، نیکی اور بھلائی کی ہو، غلط گندی اور ناروا بات نہ ہو۔

گھر اصل میدان کار ہے

اس کے فوراً بعد ارشاد ہوا۔

وَقَرْنَ فِیْ بُیُوْتِکُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِیَّةِ الْاُوْلٰی وَ اَقِمْنَ الصَّلٰوةَ وَاٰتِیْنَ الزَّکٰوةَ وَ اَطِعْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰهُ لِیُذْهِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَیْتِ وَیُطَهِّرَکُمْ تَطْهِیْرًا ○ (الاحزاب:۳۳)

اور اپنے گھروں میں قرار کے ساتھ رہو اور اگلی جاہلیت کی طرح لوگوں کے سامنے بن سنور کر نہ نکلو، نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔ اے نبی کے گھر والو! اللہ یہ چاہتا ہے کہ تم سے گندگی دور کرے اور تمھیں اچھی طرح پاک کرے۔

اس آیت میں ازواج مطہرات کو گھروں میں سکون سے رہنے (اس میں ضرورت کے تحت گھروں سے نکلنے کی ممانعت نہیں ہے) جاہلیت کی عریاں تہذیب اور اس کے گندے طور طریقوں سے بچنے، نماز قائم کرنے، زکوٰۃ دینے اور زندگی کے تمام اُمور میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت اختیار کرنے کا حکم ہے۔ اس کی حکمت یہ بیان ہوئی ہے کہ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ اس کے رسول کے گھر والوں کی زندگیاں اخلاقی گندگی سے پاک صاف اور سیرت و کردار کے بلند تر مقام پر ہوں۔ یہ دراصل ازواجِ مطہرات ہی کے لیے نہیں بلکہ پوری امت کے لیے ہدایت ہے کہ ان کی معاشرتی زندگی کیسی ہونی چاہیے اور انھیں کن حدود کا پابند ہونا چاہیے؟

کسی چیز کے لینے اور دینے کا طریقہ

یہ سورۂ احزاب کی آیات ہیں۔ اسی سورہ میں آگے چل کر اہل ایمان کو ہدایت کی گئی۔

وَاِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا فَسْئَلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ ؕ ذٰلِكُمْ اَطْهَرُ لِقُلُوْبِكُمْ وَ قُلُوْبِهِنَّ ؕ (الاحزاب:۵۳)

جب تم ان سے کوئی چیز مانگو تو پردہ کے پیچھے سے مانگو۔ یہ طریقہ تمہارے دلوں اور ان کے دلوں کو زیادہ پاک رکھنے والا ہے۔

اس ارشاد میں اور اوپر کی آیات میں حجاب کی جو حکمت و مصلحت بیان ہوئی ہے، اس کا تعلق امہات المومنین سے جتنا ہے اس سے زیادہ اُمت کی دوسری خواتین سے ہے کہ اس سے مسلمان مرد اور عورت دونوں کے دل گندے خیالات اور ناپاک جذبات سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔

گھر سے باہر جلباب کی پابندی

سورۂ احزاب ہی میں ازواجِ مطہرات اور بناتِ طیبات کے ساتھ عام اہل ایمان خواتین کے لیے بھی گھر سے باہر نکلنے کے آداب بیان ہوئے ہیں۔

یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِکَ وَ بَنٰتِکَ وَ نِسَآءِ الْمُؤْمِنِیْنَ یُدْنِیْنَ عَلَیْهِنَّ مِنْ جَلَابِیْبِهِنَّ ؕ ذٰلِکَ اَدْنٰۤی اَنْ یُّعْرَفْنَ فَلَا یُؤْذَیْنَ ؕ وَکَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا ○ (الاحزاب:۵۹)

اے نبی! کہہ دو اپنی بیویوں، اپنی بیٹیوں اور مومنوں کی عورتوں سے کہ وہ اپنی چادر کا ایک حصہ اوپر سے لٹکا لیں۔ اس سے قریب ہے کہ وہ پہچانی جائیں اور انھیں ایذا نہ پہنچائی جائے۔ اور اللہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

اس آیت میں گھر سے باہر نکلنے پر 'جلباب' کے استعمال کا حکم ہے۔ 'جلباب' اس بڑی چادر کو کہا جاتا ہے جس سے پورا بدن ڈھک جائے۔ اس کے استعمال کی حکمت یہ بیان ہوئی ہے کہ اس طرح وہ شریف، با اخلاق اور پاک باز عورتیں معلوم ہوں گی اور کوئی انھیں چھیڑنے یا ان پر دست درازی کی ہمت نہ کر سکے گا۔

غضِّ بصر

سورۂ نور میں بھی احکامِ حجاب بیان ہوئے ہیں۔ ان کا آغاز 'غضِ بصر' کے

حکم سے ہوا ہے۔ 'غض بصر' کے معنی ہیں نگاہیں نیچی رکھنا اور نامحرمات پر نظر نہ ڈالنا۔ ارشاد ہے۔

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ؕ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ○ (النور:٣٠)

ایمان والوں سے کہو کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں۔ اس میں ان کے لیے زیادہ طہارت اور پاکی ہے۔ بے شک اللہ جو کچھ وہ کرتے ہیں اس سے باخبر ہے۔

نگاہ کی آوارگی زنا اور بدکاری کی طرف لے جاتی ہے۔ غضِ بصر بدکاری سے بچنے کا ایک بڑا ذریعہ ہے۔ اس سے تقویٰ و طہارت اور نیکی کی راہ آسان ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے غضِ بصر کے ساتھ 'حفظِ فروج' یعنی شرم گاہوں کو بدکاری سے بچانے کا حکم ہے۔ اس لیے کہ ان دونوں میں گہرا تعلق ہے۔

'غض بصر' کا حکم مردوں اور عورتوں دونوں ہی کے لیے ہے۔ چناں چہ مردوں کے بعد عورتوں کو اس کا حکم دیا گیا۔ اس کے ساتھ یہ بھی بتایا گیا کہ وہ اپنی زیب و زینت کا اظہار سوائے قریب ترین افراد کے کسی کے سامنے نہ کریں۔ ارشاد ہے۔

قُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ ص وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ...

اور ایمان والی عورتوں سے کہو کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں اور اپنی زیب و زینت کا اظہار نہ کریں، سوائے اس میں سے اس زینت کے جو خود سے ظاہر ہوجائے اور اپنی اوڑھنیاں اپنے گریبانوں پر ڈالی رہیں اور اپنی زینت نہ ظاہر کریں سوائے اپنے شوہروں کے .....

محرم افراد کا حکم

اس سے آگے ان افراد کا ذکر ہے جن کے سامنے عورت اپنی زینت کا اظہار کرسکتی ہے۔ ان میں حسب ذیل سات قریبی رشتہ دار ہیں۔

باپ، خاوند کا باپ (خسر) حقیقی بیٹے، سوتیلے بیٹے، بھائی، بھتیجے اور بھانجے۔ یہ وہ رشتہ دار ہیں جو عورت کے لیے محرم ہیں، جن سے اس کا کسی حال میں نکاح نہیں ہوسکتا۔ ان ہی میں چچا، تایا اور ماموں آتے ہیں اس لیے کہ وہ بھی محارم میں داخل ہیں۔ رضاعی رشتہ داروں کا بھی یہی حکم ہے۔

اس کے ساتھ اس آیت میں حسبِ ذیل افراد کے سامنے بھی اظہار زینت کی اجازت دی گئی ہے۔ گھر اور خاندان کی، پاس پڑوس کی اور ملنے جلنے والی عورتیں، بشرطیکہ وہ دین و اخلاق کے لحاظ سے ان جیسی ہوں اس کے لیے نِسَآئِهِنَّ (اپنی عورتیں) کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ باندیاں، ایسے خدمت گار اور ملازم جنھیں عورتوں سے دلچسپی نہ ہو اور کم سن بچے۔

شوہر اور بیوی کے درمیان جنسی تعلق ہوتا ہے۔ ان کے لیے حجاب کا وہ حکم نہیں ہے جو دوسروں کے لیے ہے۔ وہ ایک دوسرے کے پورے بدن ہی سے جنسی لذت حاصل کرسکتے ہیں۔ محرم رشتے داروں اور جن لوگوں کا اوپر ذکر آیا ہے ان کے سامنے عورت، ان سے تعلق کی نوعیت اور سن وسال کی رعایت سے زیب و زینت اور بے تکلفی کا اظہار کرسکتی ہے۔

چلنے پھرنے کا ادب

آیت کے آخر میں ہدایت کی گئی ہے کہ عورت چلنے پھرنے میں بھی اپنی زینت کا اظہار نہ ہونے دے۔

وَلاَ يَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ ؕ وَتُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا اَيُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ○ (النور:۳۰)

اور اپنے پیر (زمین پر اس لیے) مار کر کہ جو زینت چھپاتی ہیں وہ علم میں آئے، نہ چلیں۔ اے ایمان والو! تم سب اللہ کی طرف رجوع کرو۔ امید ہے فلاح پاؤگے۔

دورِ جدید کے لیے حجاب ناقابلِ قبول ہے

دورِ جدید کے لیے حجاب کی یہ تعلیمات دورِ قدیم کی یادگار اور ناقابلِ قبول ہیں۔ وہ انھیں عورت کی آزادی کے خلاف اور اس کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ تصور کرتا ہے۔ اس کے نزدیک آج حالات بدل چکے ہیں اور نئے تقاضے سامنے ہیں جب تک عورت ان بندشوں سے نجات نہ پائے موجودہ حالات کا اور ان کے تقاضوں کا ساتھ نہیں دے سکتی اور ترقی نہیں کرسکتی۔

عورت کے اندر بے حجابی کا رجحان پیدا کیا گیا

دورِ جدید کی تہذیبی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس نے عورت کے اندر بے حیائی اور عریانی کا رجحان پیدا کر دیا۔ یہ رجحان جس زور اور قوت سے بڑھتا گیا اس کی عریانی میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا۔ عورت کی عریانی سے مرد کو جنسی لذت حاصل ہوتی ہے، اس لیے اس نے اس پر نہ تو کوئی اعتراض کیا اور نہ کوئی پابندی ہی لگائی بلکہ اسے اور بڑھانے کی کوشش کی۔ اس نے عورت کے ذہن میں یہ تصور بٹھادیا کہ اس کے حسن و جمال کو عریاں اور بے حجاب ہونا چاہیے۔ یہ اس کی شخصیت کی توہین ہے کہ اسے سات پردوں میں چھپایا جائے۔ صنفِ مقابل سے اس کا حجاب غیر فطری ہے۔ اس کا لباس اس کے جسم کی خوبیوں کو پوشیدہ رکھنے کے لیے نہیں، انھیں بے نقاب کرنے کے لیے ہے تاکہ صنف مقابل کی کشش اس کی طرف بڑھے، اس کے خوابیدہ جذبات تک جاگ اٹھیں اور وہ اس کی طرف بے تابانہ کھنچ پڑے۔ جس لباس میں دل ربائی کی یہ شان نہ ہو وہ عورت کے تن نازک پر زیب نہیں دیتا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ عورت کے لباس میں ایسی قطع و برید شروع ہوگئی کہ اس کے جسم کے سارے پیچ وخم نمایاں ہونے لگے اور ان حصوں کی بھی نمائش ہونے لگی جن کا کبھی کسی کے سامنے کھلنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ اب جسم پر چند دھجیاں بڑی ناگواری کے ساتھ رہ گئی ہیں۔ معلوم

نہیں وہ بھی کب اتر جائیں گی۔ خیال ہوتا ہے کہ شاید یہ بوجھ اسے زیادہ دنوں تک اٹھانا نہیں پڑے گا اس لیے کہ مکمل عریانی کی تبلیغ شروع ہوچکی۔ ہے اس کے حق میں دلائل فراہم کیے جا رہے ہیں، اسے عین انسانی فطرت کہا جا رہا ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ اس طرف قدم بڑھا چکی ہے۔ انسانی فطرت کی اس طرح توہین اس سے پہلے کبھی نہ ہوئی ہوگی۔

مرد کا لباس زیادہ ساتر ہے

موجودہ دور نے عریانی کو ایک فن اور آرٹ بنا دیا اور اس کے حق میں ایسی فضا پیدا کردی کہ عورت نے خوشی خوشی شرم و حیا کا زیور اُتار پھینکا اور بغیر کسی جھجک کے نیم عریاں گھومنے لگی۔ لیکن طرفہ تماشا یہ ہے کہ مرد نے اس آرٹ کو نہیں اپنایا۔ چناں چہ اس کے لباس میں اتنی عریانی نہیں آئی جتنی عورت کے لباس میں ہے۔ بلکہ اس کا لباس تہذیب کی ترقی کے ساتھ شاید کچھ زیادہ ہی ساتر ہوتا جا رہا ہے۔ وہ خود تو موسم کے لحاظ سے کپڑے زیب تن کرتا ہے اور بے چاری عورت کو سخت سردی میں بھی پورا تن ڈھکنے کی اجازت دینے کے لیے تیار نہیں ہے۔ اس کا لباس تو ڈھیلا ڈھالا اور آرام دہ ہوتا ہے لیکن عورت کے لیے وہ اِس قدر چست اور تکلیف دہ لباس تجویز کرتا ہے کہ اس کے ایک ایک عضوِ جسم کی پیمائش ہوجائے اور اسے آرام بھی نہ ملے، موٹے سے موٹا کپڑا استعمال کرنا اس کے لیے معیوب نہیں ہے، لیکن عورت کو اس قدر مہین اور باریک کپڑے پہناتا ہے کہ پورا جسم اندر سے چھن چھن کر نظر آنے لگتا ہے۔ یہ عجیب و غریب تضاد ہے مرد کے رویہ میں۔ لیکن عورت ابھی اس تضاد کو محسوس نہیں کر رہی ہے۔ حالاں کہ مرد جب سر سے پیر تک کئی کئی کپڑوں میں ملبوس، عورت کو کھلے بازار میں نیم عریاں لے کر چلتا ہے تو اس کے اس رویہ کے خلاف عورت کو بغاوت کردینی چاہیے۔ لیکن عورت اپنی نادانی سے اسے تہذیب کا تقاضا سمجھ بیٹھی ہے۔ اپنے جسم کی نمائش پر ندامت سے اس کا

سر جھکنا تو درکنار فخر وغرور سے اونچا ہو جاتا ہے اور وہ پورے ناز و ادا کے ساتھ مرد کی ہم نوا بن جاتی ہے۔

عریانی کے اس ماحول میں اگر کوئی عورت اسلامی حدود کی پابند ہو اور اپنے جسم کو اغیار کی نظروں سے چھپائے رکھے تو ہوس پرست مرد کا خون کھولنے لگتا ہے۔ وہ اسے ایک ایسی چلتی پھرتی لاش معلوم ہوتی ہے جس سے جذبات کو وہ آسودگی نہیں ملتی جس کی تلاش میں اس کی نگاہیں ہر طرف بھٹکتی پھرتی ہیں۔

آیئے اب ذرا ان دلائل کا جائزہ لیا جائے جن کی بنیاد پر پردہ کی مخالفت کی جاتی ہے۔

حجاب فطری جذبات پر قدغن نہیں ہے

ایک دلیل یہ دی جاتی ہے، ویسے اب اس میں کوئی جان نہیں رہی کہ عورت اور مرد کے درمیان حجاب سے ان کے جنسی جذبات اندر ہی اندر گھٹتے رہتے ہیں اور وہ سخت نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہوجاتے ہیں۔ حجاب انسان کے ایک فطری جذبہ پر غیر ضروری قدغن ہے۔ جب فطری جذبات پر قدغن لگائی جاتی ہے تو موقع ملنے پر وہ زیادہ شدت کے ساتھ ابھرتے ہیں اور ان کے بڑے بھیانک نتائج سامنے آتے ہیں۔ لیکن یہ لغو اور مہمل فلسفہ انسان کی نفسیات کے بالکل خلاف ہے۔ تجربات ہمیشہ اس کی تردید کرتے رہے ہیں۔ خود مغرب کے تجربہ نے ثابت کر دیا ہے کہ بے حجابی اور مرد و زن کے اختلاط سے جنسی جذبات زیادہ بھڑکتے ہیں اور زنا اور بدکاری عام ہوتی ہے۔ چناں چہ آزادانہ جنسی تعلقات مغربی معاشرے کا ناسور بن چکے ہیں۔ اس کی وجہ سے جس طرح خاندان کے خاندان تباہ ہو رہے ہیں، اخلاقی قدریں پامال ہو رہی ہیں اور جسمانی، دماغی اور اعصابی امراض پھیل رہے ہیں، اس سے مغربی تہذیب کی بنیادیں ہل چکی ہیں۔ ان بھیانک نتائج کو دیکھنے کے بعد کوئی سلیم الفطرت انسان بے پردگی کی حمایت اور تبلیغ کیا

کرے گا، وہ تو قانونِ حجاب کو زیادہ ضروری قرار دے گا۔ اگر یہ قانون موجود نہ ہوتا تو اس کی فطرت اسے مجبور کرتی کہ وہ اس کے لیے قانون وضع کرے اور عورت اور مرد دونوں کو اس کا پابند بنانے کی کوشش کرے۔

کیا حجاب ترقی کی راہ میں رُکاوٹ ہے؟

کہا جاتا ہے کہ پردہ مسلمان عورت کی ترقی کی راہ میں ایک بڑی رُکاوٹ ہے۔ اس کی وجہ سے وہ ادبار اور تنزل کا شکار ہے اور سیاسی، سماجی اور معاشرتی زندگی سے عملاً کٹ کر رہ گئی ہے۔ اس بندش سے آج جو عورتیں آزاد ہیں انھوں نے حیرت انگیز ترقی کی ہے اور کر رہی ہیں۔

لیکن مشکل یہ ہے کہ ہم مسلمانوں کی ترقی کی راہ میں بہت سی رُکاوٹیں بیان کی جاتی ہیں۔ کوئی پردہ کو ترقی کی راہ میں رُکاوٹ سمجھتا ہے، کسی کے نزدیک اسلام کا پورا خاندانی نظام ہی رُکاوٹ ہے، جو عورت کو گھر کی چہار دیواری میں بند کر دیتا ہے، کسی کے خیال میں اسلامی عبادات مسلمانوں کی ترقی کی راہ میں حائل ہیں۔ نماز کی وجہ سے کام کے بہترین اوقات میں خلل واقع ہوتا ہے، روزہ جیسی سخت عبادت سے صحت برباد ہوتی ہے اور حج میں وقت اور مال دونوں کا ضیاع ہے۔ کسی کی فہم و دانش میں اسلام کے مابعدالطبیعی نظریات رُکاوٹ ہیں۔ بے چارہ مسلمان حیران ہے کہ ان میں سے کس کے مشورہ پر عمل کیا جائے اور کس کے حکم کو نظر انداز کیا جائے۔ کس کو خوش کیا جائے اور کس کی ناراضی مول لی جائے؟ تکلف برطرف بہت سے زیرک و دانا حضرات اسلام ہی کو مسلمانوں کی ترقی کی راہ میں رُکاوٹ تصور فرماتے ہیں لیکن ایک عام مسلمان کی مجبوری یہ ہے کہ وہ اپنی ہزار کوتاہیوں اور خامیوں کے باوجود اسلام سے دست بردار ہونے کے لیے تیار نہیں ہے۔

پھر یہ کہ عورت کی جس ترقی کا ذکر کیا جاتا ہے اس سے اگر وہ ترقی مراد ہے

جو اُس نے 'فنونِ لطیفہ' کے نام پر عریانی، بے حیائی اور رقص و موسیقی وغیرہ میں کی ہے تو اس میں شک نہیں کہ اس نے اس میدان میں بڑی منزلیں طے کی ہیں اور ترقی کے بامِ عروج پر پہنچ چکی ہے، لیکن اس کے لیے اسے شرم و حیا، عفت و عصمت، لطف و محبت اور اطاعت و وفا شعاری جیسی اعلیٰ اخلاقی قدروں کو قربان کرنا پڑا ہے۔ ان قدروں کی پامالی کے بغیر یہ 'ترقی' ہو ہی نہیں سکتی۔ اسلام کا اس معاملہ میں ایک خاص نقطۂ نظر ہے۔ اس کے نزدیک ترقی وہ ہے جو انسان میں اعلیٰ انسانی اوصاف پیدا کرے۔ جس ترقی سے یہ اوصاف پامال ہوں اسے وہ ترقی ہی نہیں تسلیم کرتا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ موجودہ دور میں عورت نے اس سے ہٹ کر بھی مختلف علوم و فنون میں ترقی کی ہے اور علمی اور تحقیقی خدمات انجام دی ہیں۔ بعض لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ پردہ کے حدود میں رہتے ہوئے یہ ترقی ممکن نہیں ہے۔ لیکن یہ غلط فہمی بے پردگی اور بے حیائی کے اس ماحول کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے جو ہر طرف چھایا ہوا ہے، اس ماحول سے ذہن خواہ مخواہ مرعوب ہے اور آدمی کی سمجھ ہی میں نہیں آتا کہ عورت کسی پاکیزہ ماحول میں ترقی کیسے کرسکتی ہے؟ حالاں کہ یہ ترقی بے پردگی کی رہین منت ہرگز نہیں ہے۔ اس کے اسباب دوسرے ہیں۔

ایک تو جن خواتین نے کوئی بڑا کام انجام دیا وہ ان کی محنت، جد و جہد اور اپنے کام سے ان کے خلوص اور تعلق کا نتیجہ ہے۔ ان کی اس خوبی کا اعتراف ضرور کرنا چاہیے۔ یہ خدا کا قانون ہے کہ جو خلوص اور لگن کے ساتھ محنت کرتا ہے اس کا صلہ اسے ملتا ہے۔

دوسرے یہ کہ موجودہ تہذیب ایک ننگی تہذیب ہے۔ اس میں علم و فن کی سہولتیں بھی اسی وقت عورت کو مل سکتی ہے جب کہ وہ اپنا حجاب ختم کرکے بے حیاؤں کی صف میں کھڑی ہوجائے۔ اس طرح عملاً ان خواتین کے لیے ترقی کی راہیں بند کردی گئی ہیں جو اپنا حجاب باقی رکھنا چاہتی ہیں۔ ترقی کا تعلق حجاب یا بے حجابی سے نہیں بلکہ ان سہولتوں سے ہے جو عورت کو ملتی ہیں۔ اس دور کا تجربہ خود بھی بتاتا ہے کہ جن باپردہ

خواتین کو جتنے مواقع ملے انھوں نے اتنی ترقی کی اور بے پردہ خواتین سے پیچھے نہیں رہیں۔

پھر یہ کہ یہ کلیہ اسی وقت صحیح ہوسکتا ہے جب کہ عورت نے حدودِ حجاب میں رہ کر ترقی نہ کی ہو یہ ایک واقعہ ہے کہ مسلمان عورت نے ان حدود کو توڑ کر کوئی قابلِ فخر کارنامہ انجام نہیں دیا۔ اور کوئی عائشہ صدیقہؓ، کوئی ام سلمہؓ، کوئی اسماء بنت ابو بکرؓ، کوئی فاطمہ بنتِ خطابؓ اور کوئی خنساؓ، ان میں نہیں پیدا ہوئیں۔

ان حدود کے اندر رہتے ہوئے ایک طرف انھوں نے علم کی اونچی سے اونچی چوٹی سر کی، دوسری طرف وقت کے سیاسی، سماجی اور معاشرتی رجحانات سے بھی غیر متعلق نہیں رہیں بلکہ ان پر اثر انداز ہوتی رہیں۔

اس ساری تگ و دو کے ساتھ ان کی گودوں سے ایسے لعل و جواہر اُبھرے جنھوں نے تاریخ کو زینت بخشی اور ایسے اساطینِ علم اور ائمہ فن نے تربیت اور نشو ونما پائی جن کے علمی اور تہذیبی احسانات سے نوعِ انسانی سبک دوش نہیں ہوسکتی۔ کیا یہ سب کچھ جاہل اور ان پڑھ خواتین کے ہاتھوں انجام پایا؟

حدودِ حجاب کی بحث اور اس سے غلط استدلال

پردہ پر جو اعتراضات کیے جاتے ہیں ان سے گھبرا کر بعض لوگ فوراً معذرت کرنے لگتے ہیں کہ مولویوں نے پردہ کے نام پر طرح طرح کی بندشیں عائد کردی ہیں۔ اسلام ان بندشوں کے خلاف ہے۔ اسلامی شریعت میں عورت کے ہاتھ اور چہرہ کا پردہ نہیں ہے۔ وہ انھیں اجنبیوں کے سامنے کھول سکتی ہے۔ پھر اس اجازت کا دائرہ اس آزادی تک وسیع کرنا چاہتے ہیں جو موجودہ دور میں عورت کو حاصل ہے۔

بات صرف اتنی ہے کہ فقہاء کے درمیان اس مسئلہ میں اختلاف ہے کہ عورت کے حدودِ حجاب میں ہاتھ اور چہرہ داخل ہے یا نہیں؟ اسے اگر ہم مان بھی لیں کہ عورت ہاتھ اور چہرہ کھول سکتی ہے تو بھی جس 'آزاد فضا' میں عورت اس وقت زندگی گزار رہی

ہے اس کے لیے کوئی وجہ جواز اسلام سے فراہم نہیں کی جاسکتی۔[1]

اسلام عورت اور مرد کے تعلقات کو ایک خاص نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے۔حجاب اسی کا ایک حصہ ہے۔ یہ نقطۂ نظر موجودہ دور کے نقطۂ نظر سے قطعاً مختلف ہے اور قدم قدم پراس سے ٹکراتا ہے۔

اسلام نے عورت کی توجہ کا اصل مرکز اس کا گھر بتایا ہے۔ وہ اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ عورت بغیر کسی ضرورت اور مجبوری کے گھر سے نکلے۔ موجودہ دور اس بات کو ماننے ہی کے لیے تیار نہیں ہے کہ عورت کا مرکزِ عمل اس کا گھر ہونا چاہیے۔ اسلام اختلاطِ مرد و زن کا سخت مخالف ہے، جب کہ یہ اختلاط موجودہ معاشرت کا لازمی عنصر ہے۔ اسلام نے غضِ بصر کا حکم دیا ہے، جب کہ موجودہ دور کے افکار کا سارا دفتر اس تصور ہی سے خالی ہے کہ کسی اجنبی عورت پر کبھی نظر پڑ بھی جائے تو آدمی کو فوراً نگاہیں نیچی کر لینی چاہئیں۔ کچھ عجب نہیں کہ وہ مفت کی ایک لذت سے محروم ہونے کو بد ذوقی قرار دے۔ اسلام تعلیم و تربیت، کھیل کود اور تفریح کے میدان میں عورت اور مرد کے اختلاط کو ان کے اخلاق کے لیے تباہ کن سمجھتا ہے جب کہ موجودہ دور میں یہ سارا نظام دونوں کے اختلاط ہی پر مبنی ہے اور اسے اس کی خوبی سمجھا جاتا ہے۔ اسلام کا حکم ہے کہ عورت گھر سے نکلے تو راستہ میں کنارے کنارے اور مردوں سے بچ کر چلے، عبادات تک میں اس نے دونوں کو ایک دوسرے سے الگ رہنے کی تعلیم دی ہے، جب کہ موجودہ دور عورت کے ساتھ اس 'امتیازی سلوک' کا روادار نہیں ہے۔ وہ سڑکوں پر، بازاروں میں، آفسوں میں، سماجی اور معاشرتی پروگراموں میں عورت کو مرد کے شانہ بہ شانہ اور دوش بہ دوش دیکھنا چاہتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک حجاب ہی نہیں اسلام کے

---

[1] راقم نے اپنے ایک مقالہ میں احکام حجاب سے بحث کی ہے۔ اس میں ان حضرات کے دلائل کا تفصیل سے جائزہ لیا ہے جو چہرہ اور ہاتھ کو حدودِ حجاب میں داخل نہیں سمجھتے اور ان فقہاء کی رائے کو ترجیح دی ہے جن کے نزدیک عورت کا چہرہ بھی حجاب میں داخل ہے اور وہ کسی شدید ضرورت کے تحت ہی اسے اجنبیوں کے سامنے کھول سکتی ہے۔ ملاحظہ ہو۔ ماہنامہ زندگی، رامپور جلد ۲۰ شمارہ ۲، ۳، مارچ اپریل ۱۹۵۸ء

بہت سے صریح احکام کو توڑے بغیر کوئی مسلمان عورت زندگی کی تگ و دو میں اس آزادی کے ساتھ حصہ نہیں لے سکتی جس آزادی کے ساتھ آج کی عورت لے رہی ہے۔

موجودہ دور عورت کو بے قید زندگی کی دعوت دیتا ہے۔ اسلام اخلاقی حدود و قیود کو اس کے لیے ضروری قرار دیتا ہے۔ دونوں کی منزل بالکل آنکھوں کے سامنے ہے۔ وہ بڑی آسانی سے اپنی سمتِ سفر اور اپنی منزل کا فیصلہ کرسکتی ہے۔

عورت کا معاشی مسئلہ

عورت کی معاشی جد و جہد

کہا جاتا ہے کہ اسلام میں عورت کو معاشی دوڑ دھوپ کی آزادی حاصل نہیں ہے۔ حالاں کہ یہ اس کا ایک فطری اور بنیادی حق ہے کہ وہ پوری آزادی کے ساتھ حصولِ معاش کی جد وجہد کرے اور صنعت وحرفت، تجارت و زراعت غرض جس اقتصادی شعبہ میں چاہے مرد کی طرح حصہ لے۔ اس کے بغیر اسے معاشی ترقی اور استحکام حاصل نہیں ہوسکتا۔ وہ ہمیشہ مرد کی دست نگر رہے گی اور سماج میں فروتر سمجھی جائے گی۔ اس فلسفے کے تحت مغرب میں عورت اور مرد کے کام کے دائرے جو الگ الگ تھے ایک ہوگئے اور عورت معاش کے میدان میں مرد کے ساتھ تگ و دو میں مصروف ہوگئی۔ مشرق بھی اسی طرف تیزی سے دوڑ رہا ہے۔ اس کے نتائج خاندان اور معاشرہ کے حق میں بڑے خراب نکلے۔ مغرب میں تو ان کی تلخی کسی قدر محسوس کی جا رہی ہے، لیکن مشرق کو تجربہ کے جوش میں ابھی شاید اس کا احساس نہیں ہو رہا ہے۔

کم زور اور طاقت ور کا مقابلہ

یہاں اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا گیا ہے کہ عورت ایک کم زور اور نازک صنف ہے۔ وہ سخت اور محنت طلب کام نہیں انجام دے سکتی۔ اس پر ان کاموں کا بوجھ

ڈالنا بہت بڑی زیادتی ہوگی جن کے اٹھانے کے لیے وہ جسمانی اور دماغی لحاظ سے کسی طرح موزوں نہیں ہے۔ وہ جب تک جوان رہتی ہے۔ حمل، رضاعت، حیض اور نفاس کی تکلیفیں اسے برداشت کرنی پڑتی ہیں۔ اس سے اس کی صحت غیر معمولی طور پر متاثر ہوتی ہے اور اس کی قوتِ کار گھٹ جاتی ہے۔ ان مراحل سے پوری جوانی میں اسے گزرنا پڑتا ہے۔ یہ مراحل جب طے ہوجاتے ہیں تو وہ جوانی سے بڑھاپے میں داخل ہوجاتی ہے اور اس کی قوتیں کم زور پڑنے لگتی ہیں۔ موجودہ دور اس معاملہ میں عجیب تضاد کا شکار ہے۔ زبان سے تو اسے ہر کام کا اہل قرار دیتا ہے لیکن عمل کی دنیا میں اسے صنفِ نازک مان کر معاملہ کرتا ہے۔ ہلکے پھلکے کام تو اس سے لیے جاتے ہیں اور پیچیدہ اور دقت طلب کاموں کے لیے اسے مناسب تصور نہیں کیا جاتا۔ چناں چہ آج وہ زیادہ سے زیادہ دکانوں میں سودا فروش Sales Woman ہے، کہیں کلرک ہے، کسی کی سکریٹری ہے، کسی جگہ ٹاپسٹ ہے، بہت ترقی کی تو ٹیچر ہے، نرس ہے، ڈاکٹر ہے۔ اس کے برخلاف فوج میں اس کا وجود نہیں ہے۔ بھاری مشینیں اس کے حوالہ نہیں کی جاتیں، پرخطر مہمات کے لیے اس کا انتخاب نہیں ہوتا۔ وہ پائلٹ اور کپتان نہیں ہے، بھاری گاڑیاں وہ نہیں چلاتی، حتّٰی کہ نازک آپریشن کے لیے بھی مرد کی تلاش ہوتی ہے۔ اس کی قوتِ کار مرد کے مقابلہ میں کم سمجھی جاتی ہے۔ اس لیے کم از کم پرائیویٹ اداروں میں اس کی تنخواہ مرد سے کم ہوتی ہے۔ یہ حال ان ممالک کا بھی ہے جہاں ایک ہی کام کے لیے عورت اور مرد کی تنخواہ میں فرق کرنا قانوناً جرم ہے۔

کشمکش کا نتیجہ

عورت کی معاشی جدوجہد نے مرد کے ساتھ اس کی ایک طرح سے کشمکش پیدا کردی، ان کے درمیان محبت کی فضا باقی نہیں رہی اور حریفانہ جذبات نشو ونما پانے لگے۔ تجارت، زراعت، صنعت وحرفت اور ملازمت میں دونوں کا مقابلہ ہونے لگا اور ہر

ایک نے دوسرے کو پیچھے ہٹانے اور خود کو آگے بڑھانے کی کوشش شروع کردی۔ لیکن یہ ایک طاقت ور صنف اور ایک کم زور صنف کا مقابلہ تھا۔ مرد اپنی قوت و صلاحیت کی وجہ سے آگے رہا اور عورت اس کے مقابلہ میں کامیاب نہ ہوسکی۔ چناں چہ زمانۂ قدیم کی طرح آج بھی قوموں کی قیادت و سیادت مرد ہی کے ہاتھ میں ہے، اہم عہدوں اور مناصب پر اسی کا قبضہ ہے، زندگی کے سارے شعبوں پر وہی چھایا ہوا ہے۔ عورت اس سے آگے کیا نکلتی اس کی ہم سری کا دعویٰ بھی نہیں کرسکتی۔ چند شاذ و نادر مثالوں سے اس کی تردید نہیں ہوتی۔ اس لیے کہ اس طرح کی مثالیں ہر دور میں مل جاتی ہیں۔ دورِ حاضر ہی کے ساتھ یہ مخصوص نہیں ہیں۔

عورت نے کیا کھویا کیا پایا؟

کہا جاسکتا ہے کہ اس سب کے باوجود عورت کی معاشی حالت پہلے سے بہتر ہے اور وہ خود کفالت اور معاشی استحکام کی طرف بڑھ رہی ہے۔ یہ بات صحیح ہے لیکن اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ معاش کی خاطر وہ اپنے دین و اخلاق کی بڑی قربانی دے رہی ہے اور اپنے آپ کو ہر خریدار کے سامنے ایک متاعِ کاسد کی حیثیت سے پیش کرنے پر مجبور ہوگئی ہے۔ چند ٹکوں کے لیے اسے اپنی قدر و قیمت گھٹانی پڑی ہے اور اپنا احترام اور وقار کھوکر مرد کے لیے حصولِ دولت کا ایک سستا ذریعہ بننا پڑا ہے۔ آج تجارت اور صنعت و حرفت پر مرد کا قبضہ ہے، بڑے بڑے کارخانے اور فیکٹریاں اسی کے ہاتھ میں ہیں، بازار اور منڈی اسی کی ہے، حتیٰ کہ بڑے بڑے ہوٹل، کلب گھر اور سنیما کا مالک وہی ہے۔ اس طرح سارے وسائلِ دولت اس کے پاس ہیں اور عورت اس کے پھیلے ہوئے کاروبار کو فروغ دینے کا محض ایک ذریعہ ہے۔ مرد اپنی تجارت کو بڑھانے اور اپنی مصنوعات کی پبلسٹی کے لیے اسے استعمال کر رہا ہے۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ ہزار روپے کی کوئی چیز ہو یا دو پیسے کی، عورت کی پرکشش اور دل لبھانے والی تصویر

اس پر ضرور موجود ہوگی۔ بات صرف اشتہار کی حد تک نہیں رُکی بلکہ عورت کو کھلے بازار میں اس لیے بٹھایا گیا کہ وہ اپنی ناز و ادا سے مرد کی تیار کردہ مصنوعات کو فروخت کرے، اس کے قائم کردہ ہوٹلوں اور کلبوں میں مہمانوں کا استقبال، خاطر تواضع اور خدمت کرے، اس کے سنیما ہالوں میں تھرک تھرک کر اپنے جسم کے پیچ و خم کی نمائش کرے اور اس کے لیے وقت ضرورت نیم عریاں ہی نہیں پوری طرح برہنہ ہوجائے۔ حقیقت یہ ہے کہ عورت اپنی معاش کی خاطر شاید اس طرح کبھی ذلیل اور رسوا نہ ہوئی ہوگی۔

کیا دورِ جدید میں عورت کے لیے معاشی جدوجہد ضروری ہے؟

عورت کی ان معاشی سرگرمیوں کے جواز میں ایک بات یہ کہی جاتی ہے کہ موجودہ دور میں معاشی ضروریات اتنی بڑھ گئی ہیں کہ تنہا مرد انھیں پورا نہیں کرسکتا۔ اس کے لیے عورت کا معاشی جدوجہد میں شریک ہونا ضروری ہے۔ عورت اور مرد کی مشترکہ جدوجہد ہی سے آج کسی خاندان کے معاشی مسائل حل ہوسکتے ہیں۔

اس سلسلہ میں چند باتیں پیشِ نظر رہنی چاہئیں۔

۱۔ اس وقت ہر شخص کے سامنے مغرب کا معیار زندگی ہے۔ اسی منزل تک پہنچنے کے لیے وہ مضطرب اور بے چین ہے، اسی کے لیے وہ سمجھتا ہے کہ عورت کے پاس لازماً کوئی ذریعہ معاش ہونا چاہیے۔ لیکن یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ مغرب میں کام کے قابل ساری عورتیں برسرِ روزگار نہیں ہیں۔ زیادہ سے زیادہ تیس چالیس فیصد عورتوں کے پاس کوئی ذریعہ معاش ہے۔ ان برسرِ روزگار عورتوں کی بھی اکثریت مردوں کے مقابلے میں چھوٹے اور معمولی نوعیت کے کام کرنے پر مجبور ہے۔ جس کی وجہ سے وہ خاندان کی آمدنی میں کوئی خاص اضافہ نہیں کر پاتیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا مغرب میں صرف ان ہی خاندانوں کی ضرورتیں پوری ہوتی ہیں جن کی عورتیں خوب کما رہی ہیں اور وہ سارے خاندان معاشی پریشانیوں میں گرفتار ہیں جن کی عورتوں کے پاس آمدنی کا

کوئی ذریعہ نہیں ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ آج بھی یہ کوئی قاعدہ کلیہ نہیں ہے کہ عورت کی معاشی جد وجہد ہی سے خاندان کے مصارف پورے ہوسکتے ہیں، اس کے بغیر اس کی ضروریات کی تکمیل نہیں ہوسکتی۔

۲- موجودہ دور میں 'ضروریات' کی کوئی مختصر فہرست نہیں ہے بلکہ یہ اتنی لمبی چوڑی فہرست ہے کہ اس میں ناگزیر اور ضروری چیزیں اور بہت سارے اسبابِ تعیش بھی داخل ہیں۔ یہ فہرست ابھی مکمل نہیں ہے۔ اس میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ آدمی اس بڑھتی ہوئی فہرست کے مطابق ساز و سامان فراہم کرنے میں شب و روز دیوانوں کی طرح دوڑتا پھر رہا ہے، لیکن اس کے باوجود 'ضروریات' ہیں کہ پوری ہی نہیں ہوتیں۔ اگر یہ کسی طرح پوری ہو بھی جائیں تو روز بدلتا ہوا فیشن اور نت نئے نمونوں (Models) کی ایجاد اسے سکون اور چین سے بیٹھنے نہیں دیتی۔

۳- موجودہ دور نے معاشی مسابقت کا اتنا شدید رجحان پیدا کر دیا ہے کہ آدمی کے پاس لاکھوں، کروڑوں کا بینک بیلنس ہو یا قارون کا خزانہ ہی اس کے ہاتھ لگ جائے تب بھی اس کی معاشی بھوک نہیں مٹتی اور وہ ھَلْ مِنْ مَّزِیْدٍ کا نعرہ لگاتا رہتا ہے۔ اس کا علاج یہ نہیں ہے کہ عورت بھی معاشی جد و جہد میں کود پڑے بلکہ اس کا علاج یہ ہے کہ اس دنیا اور اس کے اسباب و وسائل کے بارے میں انسان کا ذہن بدلے اور وہ حرص و ہوس کی جہنم سے نکلنے کی کوشش کرے۔ جب تک یہ ذہن نہ بدلے معاشی جدوجہد میں مرد کے ساتھ عورت ہی نہیں، گھر کا بچہ بچہ شریک ہوتو بھی آدمی کے مسائل حل نہیں ہوسکتے۔

۴- عورت کی معاشی جدوجہد سے خاندان کی آمدنی میں تو اضافہ ہو جاتا ہے لیکن فطری طور پر گھر کی طرف اس کی توجہ نہیں ہو پاتی۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ عورت کی توجہ سے گھر کے مصارف کم ہوتے ہیں اور اس کی توجہ نہ ہوتو اخراجات قابو سے باہر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اس طرح اس کی آمدنی کا عملاً بہت کم فائدہ پہنچتا ہے۔

۵- عورت کی معاشی سرگرمی کی وجہ سے گھر کا سکون ختم ہو جاتا ہے۔ میاں بیوی کے درمیان اختلافات رونما ہونے لگتے ہیں اور بچوں کی صحیح تربیت نہیں ہو پاتی۔ مغربی ممالک کا تجربہ بتاتا ہے کہ اس سے پورے گھر کا نظام ہی درہم برہم ہو جاتا ہے اور گھر کی حیثیت محض ایک سرائے کی ہو کر رہ جاتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا عورت کی آمدنی اتنی قیمتی ہے کہ اس کے لیے وہ اور پورا معاشرہ اتنا بڑا نقصان برداشت کرے؟

اسلام میں عورت کی خاندانی ذمہ داریاں مقدم ہیں

اسلام معاش کی اہمیت کو تسلیم کرتا ہے۔ اس کے ساتھ وہ یہ بھی چاہتا ہے کہ عورت یک سوئی کے ساتھ خاندانی فرائض انجام دیتی رہے اور معاشی مصروفیت کی وجہ سے وہ ان سے بے رُخی یا غفلت برتنے پر مجبور نہ ہوجائے۔ اس کے لیے اس نے خاندان کی معاشی ذمہ داری مرد پر ڈالی ہے اور عورت کو اس سے سبک دوش کر دیا ہے۔ تاکہ دونوں صرف معاشی جدوجہد ہی میں نہ لگ جائیں بلکہ مرد معاش کے لیے تگ و دو کرے تو عورت گھر کا انتظام سنبھالے۔ اس طرح دونوں مل جل کر باہمی تعاون سے خاندان کا نظام چلائیں۔

بیوی کا نفقہ شوہر پر واجب ہے

اسی وجہ سے اسلام میں بیوی کا نفقہ شوہر پر لازم ہے۔ اس کا ذکر قرآن مجید میں مختلف مناسبتوں سے آیا ہے[1]۔

رسول اللہ ﷺ نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں مرد کی اس ذمہ داری ان الفاظ میں بیان فرمائی۔

ولھن علیکم رزقھن و کسوتھن بالمعروف[2]	عورتوں کا معروف کے مطابق نان ونفقہ اور لباس تم پر ان کا حق ہے۔

---

[1] ملاحظہ ہو۔ البقرۃ:۲۳۳، الطلاق:۶-۷

[2] مسلم، کتاب الحج، باب حجۃ النبیؐ

بیوی کے نفقہ پر امت کا اجماع ہے۔ جمہور کے نزدیک اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی بنیادی ضروریات پوری ہوں[۱]

نفقہ میں کھانا، کپڑا، مکان بنیادی طور پر شامل ہے۔ آدمی صاحبِ حیثیت ہو تو ملازم بھی اس میں آتا ہے۔

عورت نادار اور غریب ہو یا صاحب حیثیت اس کا نان ونفقہ ہر حال میں شوہر پر لازم ہے[۲]

عورت کی معاشی حیثیت مستحکم ہے

گھر کے اندر عورت کی مصروفیت کی وجہ سے اسلام نے اس کی معاشی حیثیت کو کم زور ہونے نہیں دیا بلکہ اسے مرد سے زیادہ مستحکم رکھا ہے۔ اس کے لیے اس نے دو قانونی اقدامات کیے ہیں۔

۱- عورت پر کوئی معاشی ذمہ داری نہیں ڈالی۔ صرف یہی نہیں کہ اس پر اپنی اولاد، ماں، باپ یا کسی قریب سے قریب تر رشتہ دار کی معاش کا بوجھ نہیں ہے بلکہ خود اس کی معاشی ذمہ داری بچپن میں اس کا باپ اُٹھاتا ہے۔ شادی کے بعد یہ ذمہ داری شوہر پر عائد ہوتی ہے۔ شوہر نہ ہو تو اولاد اس کی کفیل ہوتی ہے۔ اولاد نہ ہو یا اولاد ہو اور وہ اس قابل نہ ہو تو باپ یا قریبی محرم کو اس کی کفالت کا بوجھ اٹھانا پڑتا ہے۔

۲- وراثت میں عورت کا حق رکھا۔ ماں باپ، شوہر اور اولاد کے مال اور جائداد میں اسے یہ حق لازماً ملتا ہے۔ بعض اوقات بھائی بہن کے مال میں بھی وہ وراثت کی حق دار ہوتی ہے۔ اسی طرح شوہر سے اسے مہر ملتا ہے۔ وہ ان زیورات اور تحفے تحائف کی بھی مالک ہوتی ہے جو شادی یا خوشی کے دیگر مواقع پر اسے دئے جاتے ہیں۔ یہ سب کچھ اس کا محفوظ سرمایہ ہے۔

---

۱ ابن حجر، فتح الباری: ۴۰۳/۹

۲ قدوری مع ہدایہ، باب النفقہ

عورت پر کوئی معاشی بوجھ نہ ہونے کی وجہ سے ان ذرائع سے جو آمدنی اسے ہوتی ہے وہ پوری کی پوری اس کے پاس محفوظ ہوتی چلی جاتی ہے۔ جب کہ مرد پر گوناگوں معاشی ذمہ داریاں ہیں۔ وہ جو کچھ کماتا ہے اس کا بڑا حصہ ان ذمہ داریوں کے ادا کرنے پر اسے خرچ کرنا پڑتا ہے۔

اس طرح اسلام کے خاندانی نظام میں عورت اپنی معاش کے لیے گھر چھوڑنے اور اس کی ذمہ داریوں کو بالائے طاق رکھنے پر مجبور نہیں ہوتی اور اس سے وہ سماجی اور اخلاقی خرابیاں بھی نہیں پیدا ہوتیں جو عورت اور مرد کے ایک ساتھ مل کر معاشی دوڑ دھوپ کرنے سے پیدا ہوتی ہیں۔

عورت کی معاشی جدوجہد کے لیے بعض حدود

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اسلام عورت کے لیے معاشی جد و جہد کو بالکل ممنوع قرار دیتا ہے اور اسے ان معاشی حقوق پر قناعت کرنے کا حکم دیتا ہے جو اسے خاندانی زندگی میں حاصل ہیں۔ بلکہ صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ اسلام نے عورت کو اپنی اور دوسروں کی معاشی فکر سے آزاد کر رکھا ہے۔ اس کے باوجود اگر وہ معاشی سرگرمیوں میں حصہ لینا چاہے تو ضرور حصہ لے سکتی ہے۔ البتہ اسلام نے اسے حسبِ ذیل ہدایات دی ہیں اور ان کی پابندی کا حکم دیا ہے۔

۱۔عورت اصلاً گھر کی منتظمہ ہے۔ اس لیے اس کی اوّلین اور اصل توجہ کا مستحق اس کا گھر ہے۔ وہ شوہر کے مال کی محافظ اور اولاد کی نگراں ہے۔ لہٰذا اس کے لیے کسی ایسی مصروفیت کا اختیار کرنا صحیح نہیں ہے جس سے وہ اپنی بنیادی ذمہ داریوں کے ادا کرنے کے قابل ہی نہ رہ جائے۔

۲۔ وہ خاندانی نظام میں مرد کے تابع ہے۔ اس کی اجازت ہی سے وہ کوئی بھی کام کرسکتی ہے۔ اس لیے کہ اگر وہ اپنی آزاد مرضی سے کام کرنے لگے تو خاندان کا نظم باقی نہیں رہ سکتا۔

۳- وہ کوئی ایسا کام نہیں کرسکتی جس میں کہ مردوں کے ساتھ اس کا اختلاط ہو اس لیے کہ اس سے جو اخلاقی مفاسد پیدا ہوتے ہیں اس کے مقابلہ میں ان فوائد کی کوئی اہمیت نہیں ہے جو عورت حاصل کرسکتی ہے۔

ان ہدایات کی پابندی کے ساتھ عورت اپنی قوت و صلاحیت، سن و سال حالات، مواقع اور مزاج کے لحاظ سے کوئی بھی جائز ذریعہ معاش اختیار کرسکتی ہے، اسلام اس پر کوئی پابندی عائد نہیں کرتا۔ اسی طرح جو سرمایہ اس کے پاس ہو اسے اسلامی حدود کے اندر تمام نفع بخش کاموں میں لگا سکتی ہے۔ اس سے ہونے والی آمدنی پوری کی پوری اسی کی ہوگی۔ اس کا دعویٰ کوئی دوسرا نہیں کرسکتا۔

موجودہ دور میں ان حدود کی پابندی کے ساتھ عورت کے لیے معاشی جد و جہد بڑی دشواری محسوس ہوتی ہے، اس لیے کہ آج کا سارا معاشی نظام ان لوگوں کے ہاتھوں میں ہے جو اختلاط مرد و زن کو سماج کی ایک ضرورت ہی نہیں بلکہ اس کی خوبی تصور کرتے ہیں اور جو خاندان کی شکست و ریخت کو طوعاً و کرہاً برداشت کر رہے ہیں۔ مسلمان معاشرہ کی کم زوری یہ ہے کہ ابھی تک اس کے پاس کوئی ایسا معاشی نظام نہیں ہے جو عورت کے لیے معاشی جد و جہد کے مواقع فراہم کرے اور موجودہ دور کی خرابیوں سے بھی پاک ہو، اس کمی کو جلد از جلد دور ہونا چاہیے۔

مہر کی نوعیت اور اس کے احکام

مہر کے ذریعہ عورت خریدی نہیں جاتی

بعض اوقات مہر کا اس طرح ذکر کیا جاتا ہے کہ گویا مرد مال کے ذریعہ عورت کو خریدتا ہے۔ یہ مہر کی نوعیت سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔ اسلام کے نزدیک عورت خرید و فروخت کا سامان نہیں ہے بلکہ اس کی ایک الگ جداگانہ اور مستقل حیثیت ہے، وہ ماں باپ یا کسی اور کی ملکیت نہیں ہوتی کہ ان سے اسے خریدا جائے۔ اگر وہ ان کی ملکیت ہوتی اور مہر لے کر وہ اسے فروخت کرتے تو مہر کی رقم انھیں ملتی، جب کہ از روئے شریعت عورت خود مہر کی مالک ہوتی ہے، پھر یہ کہ اگر شوہر مہر کی وجہ سے اسے خریدتا تو وہ شوہر کی ملکیت ہوتی حالاں کہ نکاح کے ذریعہ شوہر کو عورت پر مالکانہ اختیارات حاصل نہیں ہوتے۔ شادی کے بعد بھی اس کی انفرادیت اپنی جگہ باقی رہتی ہے۔

مہر کی نوعیت

اب آیئے ذرا تفصیل سے دیکھیں کہ قرآن مجید نے مہر کو کس حیثیت سے پیش کیا ہے۔ جن عورتوں سے نکاح حرام ہے سورہ نساء میں تفصیل سے ان کے ذکر کے بعد فرمایا۔

وَاُحِلَّ لَكُمْ مَا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ ؕ فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً ؕ (نساء:۲۴)

ان کے سوا باقی سب عورتیں تمھارے لیے حلال ہیں بشرطیکہ تم ان کو اپنے مال کے بدلے طلب کرو، قید نکاح میں لانے کے لیے نہ کہ بدکاری کے لیے۔ پھر ان میں سے جن عورتوں سے تم نے نکاح کے ذریعہ فائدہ اُٹھایا ان کے مہر انھیں دو، جو فرض ہے تم پر۔

اس سے حسبِ ذیل باتیں معلوم ہوئیں۔

(۱) ایک یہ کہ محرمات کے علاوہ دوسری عورتیں حلال ہیں ان سے نکاح ہوسکتا ہے۔

(۲) اس کے لیے ضروری ہے کہ آدمی مال کے ذریعہ انھیں طلب کرے۔

(۳) یہ طلب کرنا نکاح کے مقصد سے ہو، 'سفاح' یعنی زنا اور بدکاری کے لیے نہ ہو۔ ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ زنا میں آدمی وقتی طور پر اپنی جنسی خواہش پوری کر کے عورت کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتا ہے کہ وہ خود اس کے نتائج بھگتتی رہے۔ اس کی کوئی ذمہ داری قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ اس کے برخلاف نکاح اس ارادہ سے ہوتا ہے کہ میاں بیوی کے درمیان مستقل تعلق ہوگا، دونوں ایک دوسرے کے حقوق ادا کریں گے اور اپنی ذمہ داریاں پوری کریں گے۔

(۴) آیت کے سیاق سے یہ بات بھی واضح ہے کہ نکاح اور سفاح (بدکاری) کے درمیان مہر کی وجہ سے فرق واقع ہو جاتا ہے۔ اس لیے کہ مرد پر عورت کی جو مالی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں ان میں سے ایک مہر بھی ہے۔ مہر عورت کا قانونی حق ہے اور اس کا ادا کرنا مرد کے لیے ضروری ہے۔ زنا میں مرد اس طرح کی کوئی ذمہ داری نہیں قبول کرتا۔

(۵) مرد نکاح کے ذریعہ عورت سے جو فائدہ اٹھاتا ہے مہر اس کا صلہ یا بدل ہے۔ قرآن نے کہا۔

فَمَـا اسۡتَمۡتَعۡتُمۡ بِـهٖ مِنۡهُنَّ فَاٰتُوۡهُنَّ اُجُـوۡرَهُـنَّ فَرِيۡضَـةً ؕ (نساء:۲۴) پھر ان میں سے جن عورتوں سے تم نے فائدہ اُٹھایا انھیں ان کا اجر (یعنی مہر) دو۔

زمخشری کہتے ہیں کہ قرآن نے مہر کو 'اجر' سے تعبیر کیا ہے:

لان المهر ثواب علی البضع[1] اس لیے کہ مہر جنسی تعلق کا جزا یا صلہ ہے۔

فقہ حنفی میں مہر کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے:

انه اسم للمال الـذی یجب فی عقد النکاح علی الزوج فی مقابلة البضع اما بالتسمیة او بالعقـد[2] مہر اس مال کو کہا جاتا ہے جو عقد نکاح میں شوہر پر جنسی استفادہ کے مقابلہ میں واجب ہوجاتا ہے۔ یہ مہر کے تعین سے بھی ہوسکتا ہے اور عقد کی وجہ سے بھی۔

اس سے یہ بات واضح ہے کہ مہر کی وجہ سے مرد کو عورت سے جنسی استفادے کا تو حق ملتا ہے اس پر کسی قسم کا مالکانہ اقتدار حاصل نہیں ہو جاتا۔ بلاشبہ عورت بھی مرد سے جنسی فائدہ اٹھاتی ہے لیکن اس پر مہر کی نوعیت کی کوئی چیز واجب نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام عورت پر کوئی مالی بوجھ ڈالنا نہیں چاہتا۔ اس نے اسے ہر طرح کی مالی اور معاشی ذمہ داریوں سے سبک دوش کر رکھا ہے۔

مہر خلوص کی دلیل ہے

مہر کو اجر اس لیے کہا گیا ہے کہ یہ عورت کو نکاح کے مقابلے میں ملتا ہے جو اس کی قانونی حیثیت کو ظاہر کرتا ہے۔ اس کے لیے قرآن و حدیث میں 'صدقہ' اور 'صداق' کے الفاظ بھی استعمال ہوئے ہیں جو اس کی روح کی ترجمانی کرتے ہیں۔ قرآن شریف میں ہے۔

وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحۡلَةً ؕ (نساء:۴) عورتوں کو ان کے مہر خوش دلی سے دو۔

'صدقہ' اور 'صداق' کے الفاظ 'صدق' سے نکلے ہیں۔ صدق کا لفظ عربی میں

---

[1] الکشاف عن حقائق التنزیل: ۲۸۳/۱

[2] العنایہ علی الہدایہ: ۴۳۴/۲

بہت وسیع معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے۔ اس کے مفہوم میں اخلاص، محبت، دوستی، آدمی کا بات کا پکا ہونا، کسی سے جو حسن ظن ہو اس پر پورا اترنا، آزمائش کے وقت سچا ثابت ہونا جیسے جذبات اور اقدامات شامل ہیں[1]

مہر کے لیے لفظ صدقہ کے استعمال میں بڑی معنویت ہے۔ مالکی فقیہ علامہ صاوی کہتے ہیں: صدقہ کا لفظ صدق سے ماخوذ ہے جو کذب کی ضد ہے۔ مہر کے لیے صدقہ کا لفظ اس لیے اختیار کیا گیا ہے کہ اس کا میاں بیوی کے درمیان موجود ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ دل سے شریعت کی موافقت کرتے ہیں[2]

ملاّ جیون حنفی کہتے ہیں کہ یہ شوہر کے دعوائے محبت میں سچے ہونے کی دلیل ہے[3]

حقیقت یہ ہے کہ مہر شوہر کے خلوص اور محبت کی علامت ہے، اسے بیوی کی قیمت قرار دینا اس کے خلوص کی توہین ہے۔ مہر کے ذریعہ شوہر یہ ثابت کرتا ہے کہ عورت نے اس کے ساتھ جو حسنِ ظن قائم کیا اس پر وہ پورا اترے گا اور اسے دھوکا اور فریب نہیں دے گا۔

مہر عطیہ ہے

اس کے ساتھ آیت میں 'نحلة' کا لفظ بڑا معنی خیز ہے جو اس جذبہ اور کیفیت کو زیادہ بہتر طریقے سے واضح کرتا ہے جو مہر کی ادائیگی کے سلسلے میں ہونا چاہیے۔ یہاں 'نحلة' کے تین مفہوم بیان کیے گئے ہیں۔ لغت کے لحاظ سے تینوں ہی مفہوموں کی گنجائش ہے۔

(۱) دین ومذہب، یعنی عورتوں کو ان کے مہر ادا کرو۔ اس کا ادا کرنا شرعاً اور قانوناً تم پر فرض ہے۔

---

[1] ابن منظور، لسان العرب، مادہ: ص، د، ق

[2] حاشیہ الصاوی علی الشرح الصغیر: ۲/ ۴۲۸

[3] تفسیرات احمدیہ: ص ۱۲۹

(۲) خوش دلی سے ادا کرنا، مطلب یہ کہ عورت کے مطالبے اور اصرار کے بغیر اس کا مہر بہ خوشی ادا کیا جائے۔ اس میں ٹال مٹول نہ کی جائے اس لیے کہ جو چیز بحث و تکرار اور لڑائی جھگڑے کے بعد دی جائے اسے نحلہ نہیں کہا جاتا۔

(۳) عطیہ دینا، مہر عطیہ اس معنی میں ہے کہ شوہر اس کے عوض عورت سے کچھ نہیں لیتا۔ باقی رہا ازدواجی زندگی کا فائدہ تو جس طرح مرد یہ فائدہ اٹھاتا ہے اسی طرح عورت بھی یہ فائدہ حاصل کرتی ہے۔ اس مفہوم کی وضاحت ان الفاظ میں کی گئی ہے۔

ان الله تعالى جعل منافع النكاح من قضاء الشهوة والتوالد مشتركاً بين الزوجين ثم امر الزوج بان يعطى الزوجة المهر فكان ذٰلک عطية من الله ابتداء[1]

اللہ تعالیٰ نے منافعِ نکاح یعنی جنسی خواہش کی تکمیل اور اولاد کا پیدا کرنا، میاں بیوی کے درمیان مشترک رکھے ہیں (یہ کسی ایک ہی کو نہیں حاصل ہوتے) اس کے ساتھ اس نے شوہر کو حکم دیا کہ وہ بیوی کو مہر دے۔ یہ گویا اللہ کی طرف سے شروع ہی میں ایک عطیہ ہے۔

اور نحلہ کے جو مختلف معنی بیان ہوئے ہیں ان کا ذکر کرتے ہوئے علامہ ابن کثیر لکھتے ہیں:

ومضمون كلامهم ان الرجل يجب عليه دفع الصداق الى المرأة حتما و ان يكون طيب النفس لذالک کمایمنح المنيحة و يعطى النحلة طيباً بها كذالک يجب ان يعطى المراة صداقها طيبا بذٰلک[2]

ان کی ان تشریحات کا خلاصہ یہ ہے کہ آدمی کے لیے قطعاً واجب ہے کہ وہ مہر بیوی کے حوالہ کرے۔ یہ خوش دلی سے ہونا چاہیے جس طرح آدمی خوشی کے ساتھ کسی کو کوئی عطیہ دیتا ہے اسی کیفیت کے ساتھ مہر بھی ادا کرے۔

---

[1] تفسیر کبیر: ۱۴۵/۳۔

[2] تفسیر ابن کثیر: ۴۵۱/۱

عورت کا مہر واجب ہونے کے باوجود جس طرح اسے یہاں 'نحلہ' سے تعبیر کیا گیا ہے اسی طرح عورت کا نفقہ بھی واجب ہے۔ اسے حدیث میں 'صدقہ' کہا گیا ہے۔ ان الفاظ کی معنویت سے بحث کرتے ہوئے علامہ ابن المنیر کہتے ہیں:

تسمية النفقة صدقة من جنس تسمية الصداق نحلة فلما كان احتياج المرأة الى الرجل كاحتياجه اليها فى اللذة والتانيس والتحصين و طلب الولد كان الاصل الا يجب عليه شئ الا ان الله خص الرجل بالفضل على المرأة بالقيام عليها ورفعه بذلك درجة فمن ثم جاز اطلاق النحلة على الصداق والصدقة على النفقة[1]

نفقہ کو 'صدقہ' اسی معنی میں کہا گیا ہے جس معنی میں مہر کو 'نحلہ' کہا گیا ہے۔ اس لیے کہ لذت نفس، انس و محبت، عفت و عصمت اور اولاد کی طلب کے لیے جس طرح عورت کو مرد کی حاجت ہے، اسی طرح مرد کو بھی عورت کی حاجت ہے جب دونوں ایک دوسرے کے محتاج ہیں تو ہونا یہ چاہیے تھا کہ مرد پر کوئی چیز واجب نہ ہوتی لیکن اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر مرد کو عورت پر یہ فضیلت دی ہے کہ وہ اس کی دیکھ بھال کرنے والا ہے۔ اسی لیے اس نے اس کا درجہ بلند کیا ہے۔ اس وجہ سے 'نحلہ' کا اطلاق مہر پر اور صدقہ کا اطلاق نفقہ پر جائز ہے۔

مہر کا حکم قطعی اور ابدی ہے

بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ ہوسکتا ہے کہ کسی زمانے میں مہر کو اظہارِ محبت کا ذریعہ سمجھا جاتا ہو اور اس وقت اس کی اہمیت اور افادیت بھی رہی ہو لیکن ہر زمانے کے حالات اور سماجی رجحانات مختلف ہوتے ہیں۔ موجودہ دور کی سماجی قدریں اسے اس محبت کے منافی سمجھتی ہیں جو میاں بیوی کے درمیان ہونی چاہیے۔ اور آج عملاً مہر کی بہت

[1] فتح الباری: ۹/۴۰۲-۴۰۱

زیادہ اہمیت بھی نہیں رہ گئی ہے۔ اس لیے کہ عورت خود کمانے لگی ہے اور کسی کی دست نگر نہیں رہ گئی ہے۔

اس پر دو پہلوؤں سے غور ہوسکتا ہے۔ ایک یہ کہ شریعت نے مہر کو کیا حیثیت دی ہے؟ کیا یہ کوئی عارضی حکم تھا یا اس کی نوعیت ایک ابدی قانون کی ہے؟ دوسرے یہ کہ کیا مہر کی افادیت محض وقتی تھی جو وقت گزرنے کے ساتھ ختم ہوگئی یا اس کی افادیت اب بھی باقی ہے؟

جہاں تک شریعت کا تعلق ہے اس نے اسے ایک ابدی حکم ہی کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ مہر سے متعلق بعض آیات اوپر گزر چکی ہیں۔ ان آیات میں مہر ادا کرنے کا مطلقاً حکم دیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ کسی قسم کے حالات کی کوئی شرط یا کسی زمانے کی کوئی قید نہیں ہے۔ اس کے علاوہ قرآن مجید نے مہر کے احکام تفصیل سے بیان کیے ہیں۔ ان کے ذیل میں کہیں کوئی اشارہ تک نہیں ملتا کہ یہ وقتی حکم ہے۔ اس طرح کے قطعی اور واضح احکام کے بارے میں بھی ان کے وقتی ہونے کا سوال کھڑا ہوجائے تو شاید قرآن مجید کا کوئی حکم ایسا نہیں ہوگا جسے ابدی کہا جاسکے۔

فقہاء کا اس پر اتفاق ہے کہ مہر کے بغیر کسی عورت سے جنسی تعلق قائم کرنا حرام ہے، چاہے عورت نے بہ خوشی اپنے آپ کو اس کے حوالے کیوں نہ کر دیا ہو، الاّ یہ کہ وہ اس کی باندی ہو۔ ابن حجرؒ فرماتے ہیں۔

وقد اجمعوا علٰی انه لا یجوز لاحد ان یطأ فرجا وهب له دون الرقبة بغیر صداق[1]

کسی شخص کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ بغیر مہر کے وہ کسی عورت سے جنسی تعلق رکھے سوائے اس کے کہ وہ اس کی لونڈی ہو۔ اس پر علماء کا اجماع ہے۔

ابنِ رشد کہتے ہیں۔

---

[1] فتح الباری: ۹/۱۶۷

انھم اتفقوا علی انہ شرط من شروط الصحۃ و انہ لا یجوز التواطؤ علی ترکہ[1]

نکاح کے صحیح ہونے کے جو شرائط ہیں ان میں سے ایک شرط مہر بھی ہے۔ اس کے ترک پر اتفاق کر لینا جائز نہیں ہے۔ اس مسئلے پر فقہاء کے درمیان اتفاق پایا جاتا ہے۔

مہر کی نوعیت ایسی ہے کہ اگر کوئی شخص نکاح کے وقت یہ شرط لگا دے کہ وہ مہر ادا نہیں کرے گا، یا یہ کہ وہ مہر کا ذکر ہی نہ کرے تو بھی حنفیہ کے نزدیک وہ خود بہ خود واجب ہو جائے گا۔ اس لیے کہ یہ فیصلہ کرنے کا اختیار کسی کو نہیں ہے کہ مہر دے یا نہ دے، بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عائد کیا ہوا ایک فرض ہے جسے بہر حال پورا کرنا ہے۔ امام مالک تو یہاں تک فرماتے ہیں کہ وہ نکاح ہی نہیں ہوگا جس میں آدمی نے مہر نہ دینے کی شرط لگا دی ہو[2]

مہر کی افادیت

اب اس کی افادیت پر غور کیجیے۔ نکاح سے جس جنسی تعلق کی اجازت ملتی ہے مہر سے اس کی قدر و قیمت ظاہر ہوتی ہے۔ اس سے آدمی میں یہ احساس اُبھرتا ہے کہ شریعت کی جس اجازت سے وہ فائدہ اُٹھا رہا ہے اس کے لیے اس کو اپنا پیسہ صرف کرنا پڑا ہے۔ اور اس سے یہ جذبہ ختم ہوتا ہے کہ آدمی عورت کو حقیر اور بے قیمت سمجھے اور اس بات کو عورت پر بہت بڑا احسان سمجھے کہ اس نے اس کو اپنے حبالۂ عقد میں لے لیا اور اس سے تعلق رکھا۔

مہر عقدِ زواج کو باقی رکھنے کا بھی ایک بڑا ذریعہ ہے۔ یہ ایک نفسیاتی بات ہے کہ آدمی جس چیز کے حصول کے لیے اپنا پیسہ صرف کرے اس کو آسانی سے ضائع کرنا نہیں چاہتا، بلکہ اس کو حتی الوسع باقی رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کے علاوہ طلاق کی راہ

---

[1] ابن رشد، بدایۃ المجتہد و نہایۃ المقتصد: ۱۸/۲

[2] العنایہ علی الہدایہ: ۴۳۴/۲، ۴۳۵

میں بھی یہ ایک رُکاوٹ ہے۔ کیوں کہ طلاق میں ایک تو موجودہ بیوی کا مہر جائے گا اور پھر دوسری شادی کے لیے اس کو دوبارہ مہر کی رقم خرچ کرنی ہوگی۔

مہر میں ایک پہلو سے عورت کی دل جوئی بھی ہے اور مالی مدد بھی۔ اس سے وہ اپنی ضروریات میں فائدہ اٹھا سکتی ہے، کسی بہتر مصرف میں اس کو صرف کرسکتی ہے، یا نفع بخش کاموں میں لگا سکتی ہے۔

باقی رہی یہ بات کہ آج عورت کے لیے معاش کے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ اس لیے مہر کی اہمیت نہیں ہے، اس پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا عورت کے لیے اتنی معاشی آسانیاں فراہم ہوگئی ہیں کہ وہ مرد سے بے نیاز ہوگئی ہے۔ اگر ایسا ہے بھی تو ان آسانیوں کی وجہ سے عورت کو مہر کے حق سے محروم کر دینا کیا اس کے حق میں مفید ہوگا؟ دوسرے یہ کہ مہر کی افادیت محض معاشی نہیں، اخلاقی اور نفسیاتی بھی ہے۔ کیا اسے نظر انداز کیا جاسکتا ہے؟[1]

مہر کی مقدار

مہر کی مقدار کا مسئلہ بھی بار بار اُبھرتا رہتا ہے۔ یہاں اس کی وضاحت کی کوشش کی جائے گی۔ شریعت نے مہر کی مقدار متعین نہیں کی ہے، بلکہ اس کو زوجین کے معاشی وسماجی حالات، ان کی خاندانی روایات، باہمی تعلقات اور آپس کے اعتماد پر چھوڑ دیا ہے۔ وہ چاہیں تو کم سے کم مہر بھی رکھ سکتے ہیں اور اس کی بھی انھیں اجازت ہے کہ وہ اپنے حالات کے تحت زیادہ سے زیادہ مہر مقرر کریں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وَاِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ ۙ وَّ اٰتَيْتُمْ اِحْدٰهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْئًا اَتَاْخُذُوْنَهٗ بُهْتَانًا وَّ اِثْمًا مُّبِيْنًا ۝ (النساء:۲۰)

اگر تم ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی کو بدلنا چاہتے ہو اور تم نے ان میں سے کسی کو ڈھیر سا مال دے دیا ہے تو بھی اس میں سے کچھ واپس نہ لو۔ کیا تم اس مال کو لوگے جب کہ وہ تمہارے لیے ناحق اور صریح گناہ ہوگا۔

---

[1] عورت کے معاشی مسئلہ پر بحث اس سے پہلے گزر چکی ہے۔

روایات میں آتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے اپنے ایک خطبہ میں مہر کی زیادتی سے منع فرمایا تو ایک عورت نے برسرِ منبر ٹوکا کہ آپ کو اس کا حق نہیں ہے اس لیے کہ یہ قرآن کے خلاف ہے۔ پھر اس نے اس آیت کا حوالہ دیا۔ اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ ایک عورت نے صحیح بات کہی ہے۔ عمرؓ کا فیصلہ غلط تھا۔[1]

احادیث میں زیادہ مہر مقرر کرنے سے منع تو نہیں کیا گیا ہے، البتہ اس بات کی ترغیب دی گئی ہے کہ مہر کی مقدار کم رکھی جائے۔ ایک حدیث میں ہے:

ان اعظم النکاح برکۃ ایسرہ مؤنۃ[2] — سب سے زیادہ برکت والا نکاح وہ ہے جس کا بوجھ (مہر) ہلکا ہو۔

یہ ایک تاریخی واقعہ ہے کہ دورِ رسالت میں مہر کی مقدار کم رکھی جاتی تھی۔ چناں چہ حضرت ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے عہد میں ہم لوگوں کا مہر دس اوقیہ یعنی چار سو درہم ہوا کرتا تھا۔[3]

خود ازواجِ مطہرات کا مہر ساڑھے بارہ اوقیہ یعنی پانچ سو درہم تھا۔[4]

حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ مہر بہت زیادہ مت رکھو، اس لیے کہ اگر مہر کی زیادتی دنیا میں عزت کی اور آخرت میں تقویٰ اور خدا ترسی کی دلیل ہوتی تو نبی ﷺ اس کے زیادہ مستحق تھے کہ آپ زیادہ مہر رکھتے لیکن آپ کی بیویوں اور بیٹیوں میں سے کسی کا مہر بارہ اوقیہ سے زیادہ نہیں تھا۔[5]

---

[1] فتح الباری: ۱۶۱/۹

[2] مسند احمد: ۸۲/۶

[3] نسائی، کتاب النکاح، باب القسط فی الاصدقہ

[4] مسلم، کتاب النکاح، باب الصداق الخ۔ ابوداؤد، کتاب النکاح باب الصداق۔ نسائی حوالہ سابق۔ ابن ماجہ، ابو النکاح باب صداق النساء۔

[5] ابوداؤد، کتاب النکاح، باب الصداق۔ ترمذی، ابواب النکاح، باب ماجا فی مہور النساء۔ نسائی کتاب النکاح، باب القسط فی الاصدقہ۔

ایک انصاری نے چار اوقیہ یعنی دو سو درہم مہر مقرر کیا تو آپؐ نے فرمایا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا یہ پہاڑ چاندی کا ہے اور تم اس سے چاندی تراش تراش کر لے آتے ہو[1]

اب سوال یہ ہے کہ کم سے کم مہر کی مقدار کیا ہوسکتی ہے؟ شریعت نے اس کی کوئی حد متعین کی ہے یا نہیں؟ اس پر فقہاء کا قریب قریب اجماع ہے کہ مالی قدر و قیمت رکھنے والی چیز ہی مہر ہوسکتی ہے۔ جس چیز کی مالی لحاظ سے کوئی قیمت نہ ہو وہ مہر نہیں بن سکتی۔ اس کے ذریعہ نکاح جائز نہیں ہے[2] اس لیے کہ قرآن نے صاف صاف الفاظ میں کہا ہے:

وَاُحِلَّ لَكُمْ مَا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ (النساء:۲۴)	حلال کی گئی ہیں تمہارے لیے ان کے سوا (محرمات کے سوا) سب ہی عورتیں کہ تم ان کو اپنے مالوں کے بدلے چاہ سکتے ہو۔ (نکاح کرسکتے ہو)

قرآن مجید نے مطلقاً 'اموال' کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اس لیے فقہاء کے ایک گروہ کی رائے یہ ہے کہ وہ جس طرح زیادہ سے زیادہ ہوسکتا ہے، اسی طرح کم سے کم بھی ہوسکتا ہے۔ جب تک کوئی چیز اتنی حقیر مقدار کو نہ پہنچ جائے کہ اس کی مالیت ختم ہوجائے اور اس پر مال کا اطلاق ہی نہ ہوسکے، اس میں مہر بننے کی صلاحیت موجود ہوگی۔ امام نووی نے لکھا ہے کہ یہ رائے علمائے سلف و خلف کی اکثریت کی ہے۔ اس میں یحیٰی بن سعید، ابو الزناد، ربیعہ، ابن جریج، مسلم بن خالد، امام لیث، امام ثوری، ابن ابی لیلیٰ، امام شافعی، داؤد ظاہری، فقہائے اہل حدیث اور ابن وہب مالکی وغیرہ شامل ہیں[3]

---

[1] مسلم، کتاب النکاح، باب ندب من اراد نکاح امرأۃ الخ

[2] اس سے صرف ابن حزم نے اختلاف کیا ہے۔ ان کے نزدیک ایک دانہ گندم بھی مہر ہوسکتا ہے۔ مہر کے لیے کسی چیز کا مالی قیمت رکھنا ضروری نہیں ہے۔ (نیل الاوطار: ۶/۳۰۱-۳۱۱)

[3] نووی: شرح مسلم: ۱/۴۵۷

اس کے برعکس امام ابوحنیفہ، امام مالک، سعید بن جبیر، امام نخعی، ابن شبرمہ وغیرہ کی رائے یہ ہے کہ شریعت نے مہر کی کم سے کم مقدار متعین کردی ہے۔ اس سے اس کا کم ہونا صحیح نہیں ہے[۱] البتہ ان حضرات کے درمیان اس میں اختلاف ہے کہ مہر کی کم سے کم مقدار شریعت نے کتنی رکھی ہے؟ امام ابوحنیفہ کے نزدیک یہ مقدار دس درہم ہے۔ امام مالک فرماتے ہیں کہ اس کی مقدار ربع دینار یا تین درہم ہے۔ ابن شبرمہ نے اس کی مقدار پانچ درہم مانی ہے۔ امام نخعی سے ۴۰ درہم اور دس درہم دونوں طرح کی روایتیں منقول ہیں[۲]

امام شافعی اور ان کے ہم خیال فقہاء کی ایک دلیل قرآن مجید کی آیت بھی ہے۔

فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً ؕ (نساء:۲۴)

پھر تم نے ان عورتوں میں سے جن سے فائدہ اٹھایا ہے، ان کے طے شدہ مہر ادا کرو۔

اس سے معلوم ہوا کہ مہر ایک معاوضہ ہے جو عورت سے استفادہ کے بدلے میں مرد پر واجب ہوتا ہے۔ معاوضہ کو باہمی رضا مندی سے طے ہونا چاہیے، ورنہ وہ معاوضہ نہیں رہے گا۔ مہر کی مقدار اگر پہلے سے متعین کردی جائے تو اس سے معاوضہ کا تصور نکل جائے گا اور قرآن کا منشا پورا نہ ہوگا۔

اس گروہ کی دوسری دلیل بخاری و مسلم کی ایک روایت ہے جس میں آتا ہے کہ ایک عورت رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا کہ میں اپنی ذات

۱۔ اس کی تائید میں قرآن مجید کی یہ آیت بھی پیش کی گئی ہے۔ قَدْ عَلِمْنَا مَا فَرَضْنَا عَلَيْهِمْ فِيْٓ اَزْوَاجِهِمْ (احزاب:۵۰) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نہ صرف یہ کہ مہر کو واجب کیا ہے بلکہ اس کی حد بھی متعین کردی ہے۔ اب ہمیں ان دونوں ہی باتوں میں اس کی اطاعت کرنی ہوگی۔ اگر کوئی شخص صرف ایجاب مہر کو مانتا ہے اور اس کے تعین کو نہیں مانتا تو وہ اس آیت کے منشا کو رد کرتا ہے۔ الکفایہ علی الہدایہ: ۱۵۹/۲ اس آیت سے یہ استدلال بظاہر بہت واضح اور مستحکم نہیں ہے۔

۲۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔ نووی، شرح مسلم: ۴۵۷/۱۔ ابن حجر، فتح الباری: ۱۶۴/۹

آپ کو ہبہ کرتی ہوں۔اس سے اس کا مقصد یہ تھا کہ آپؐ اس کو اپنے حبالۂ عقد میں لے لیں۔ وہ دیر تک کھڑی رہی، لیکن آپ نے اس کو کوئی جواب نہیں دیا۔ آپ کی خاموشی کو دیکھ کر ایک شخص نے عرض کیا۔ حضور! اگر آپ کو اس کی ضرورت نہیں ہے تو اس کا نکاح مجھ سے کرا دیجیے۔ آپ نے اس سے دریافت کیا، کیا تمہارے پاس مہر دینے کے لیے کچھ ہے؟ اس نے عرض کیا کہ اپنے اس تہمد کے علاوہ اور کوئی چیز میرے پاس نہیں ہے۔ آپ نے فرمایا: اگر تم اپنا تہمد اسے دے دوگے تو تمہارے پاس تہمد نہیں رہے گا۔ گھر جاؤ اور کوئی چیز لے آؤ۔ اس نے کہا حضور! میرے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے۔ آپ نے فرمایا: جاؤ لوہے کی ایک انگوٹھی ہی لے آؤ۔ اس نے ادھر ادھر کوشش کی لیکن وہ بھی اسے نہیں ملی۔ آپ نے فرمایا اچھا تو بتاؤ کیا تمھیں قرآن کا کوئی حصہ یاد ہے؟ اس نے کہا۔ ہاں! فلاں فلاں سورتیں یاد ہیں۔ آپ نے فرمایا تمھارے پاس جو قرآن ہے اس کے عوض میں نے تمہارا نکاح اس سے کر دیا[1]

اس حدیث سے یہ استدلال کیا گیا ہے کہ مہر کی کمی کی کوئی حد نہیں ہے[2] زوجین اگر راضی ہوں تو مہر چھوٹی سی چھوٹی چیز بھی ہوسکتی ہے جیسے ایک کوڑا، جوتا، لوہے کی انگوٹھی یا اس جیسی کوئی چیز[3]

جو لوگ مہر کی کم سے کم مقدار کو متعین سمجھتے ہیں انھوں نے اس کا جواب دیا ہے اور اپنی تائید میں بعض دوسرے دلائل پیش کیے ہیں۔ یہاں ہم احناف کے بعض دلائل کا جائزہ لینا چاہتے ہیں۔

احناف نے پہلی دلیل کا جواب یہ دیا ہے کہ مہر کی نوعیت زوجین کے درمیان طے ہونے والے محض ایک معاوضہ کی نہیں ہے بلکہ اس میں عبادت کا پہلو بھی ہے۔ اس

۱؎ بخاری، کتاب النکاح۔ مسلم، کتاب النکاح، باب الصداق وجواز کونہ تعلیم قرآن وخاتم حدید الخ

۲؎ ابن حجر فرماتے ہیں لاحد لاقل المھر۔ فتح الباری: ۱۶۵/۹

۳؎ نووی، شرح مسلم: ۴۵۷/۱

لیے کہ کوئی بھی معاوضہ فریقین کی مرضی سے ختم کیا جاسکتا ہے لیکن مہر کو میاں بیوی اپنی مرضی سے ختم نہیں کرسکتے۔[1]

مذکورہ بالا حدیث کے متعدد جوابات دیے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ ولو خاتماً من حدید (لوہے کی ایک انگوٹھی ہی سہی) کا یہ مطلب نہیں ہے کہ فی الواقع لوہے کی انگوٹھی مہر بن سکتی ہے بلکہ یہ ایک انداز بیان ہے کہ جو مہر بھی تم دے سکتے، ہو دو۔ اس کی کم سے کم مقدار معلوم و متعین تھی۔ اس کا دوسرا جواب یہ دیا گیا ہے کہ اس میں 'مہر معجّل' کا ذکر کیا گیا ہے۔ یعنی اس وقت مہر کا جو حصہ بھی ادا کرسکتے ہو وہ ادا کردو، باقی تمہارے ذمہ واجب ہوگا، اس کی تائید میں یہ بات پیش کی گئی ہے کہ مہر معجّل کا دورِ اول میں رواج عام تھا اور اس کی بہت اہمیت محسوس کی جاتی تھی۔ تیسری توجیہ یہ کی گئی ہے کہ یہ معاملہ صرف اس شخص کے ساتھ خاص تھا، یہ دوسروں کے لیے نمونہ نہیں ہے۔ اس کی تائید میں ایک حدیث بھی پیش کی جاتی ہے لیکن وہ صحیح نہیں ہے۔ چوتھی توجیہ یہ کی گئی ہے کہ جب آپ نے دیکھا کہ اس شخص کو قرآن شریف کی کئی سورتیں یاد ہیں تو آپ نے اس کی غربت کے باوجود اس عورت کا نکاح اس سے کردیا اور مہر طے نہیں کیا۔ لیکن 'مہر مؤجل' اس پر خود بہ خود فرض ہوگیا جو اس کو بعد میں ادا کرنا پڑا ہوگا۔ لیکن یہ سب تاویلیں بہت کم زور ہیں اور حدیث کے بیان پر پوری طرح منطبق نہیں ہوتیں۔[2]

احناف کے مسلک کی بنیاد بیہقی کی ایک روایت ہے۔

لامهر دون عشرة دراهم مہر کی مقدار دس درہم سے کم نہیں ہوسکتی۔

اس کی تائید حضرت علیؓ کی ایک دوسری روایت سے بھی ہوتی ہے جس کو دارِ قطنی اور بیہقی نے روایت کیا ہے۔

---

[1] بدایۃ المجتہد: ۲

[2] تفصیل کے لیے دیکھیے، فتح الباری: ۹/۱۶۷-۱۶۸

لاصداق اقل من عشرۃ دراھم[1]   مہر دس درہم سے کم نہیں ہوسکتا۔

جن لوگوں نے مہر کی مقدار متعین سمجھی ہے اسے انھوں نے 'قطعِ ید' کے نصاب پر بھی قیاس کیا ہے احناف کے نزدیک 'قطعِ ید' کا نصاب دس درہم ہے۔ اس لیے وہ کہتے ہیں کہ مہر کا نصاب بھی کم از کم دس درہم ہونا چاہیے۔ کیوں کہ یہ نصاب ظاہر کرتا ہے کہ دس درہم سے کم قیمت کی مالیت کسی محترم عضو کو حلال نہیں کرتی۔ لیکن ایک تو 'قطعِ ید' کا یہ نصاب متفق علیہ نہیں ہے[2] دوسرے یہ کہ عورت سے استمتاع کو قطع ید پر قیاس کرنا بہت دور کا بلکہ صحیح معنیٰ میں ایک بے بنیاد قیاس ہے۔ 'قطعِ ید' ایک جرم کی سزا ہے اور اس کی وجہ سے آدمی میں نقص پیدا ہوجاتا ہے لیکن عورت سے استمتاع میں نہ تو سزا کا کوئی تصور ہے اور نہ اس سے کوئی خرابی پیدا ہوتی ہے بلکہ یہ باہمی مودت اور ایک خاص جذبے کی تسکین کا ذریعہ ہے۔ دونوں کے درمیان قیاس کی کوئی مشترک بنیاد نہیں ہے۔[3]

احادیث سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ عہدِ رسالت میں مہر کی مقدار دس درہم

---

[1] سنن دار قطنی، کتاب النکاح، باب المہر۔ سنن بیہقی: ۷/۲۴۰ مطبوعہ حیدر آباد

یہ دونوں حدیثیں محدثین کے نزدیک ضعیف ہیں۔ حضرت علیؓ کی روایت موقوف ہے کیوں کہ اس کو حضرت علیؓ سے شعبی نے روایت کیا ہے اور دونوں میں ملاقات ثابت نہیں ہے۔ نیز اس کے ایک دوسرے راوی، داؤد اودی کو بھی ضعیف قرار دیا گیا ہے۔ پہلی حدیث کا ایک راوی مبشر بن عبید ہے جس کو محدثین نے متروک الحدیث کہا ہے۔ امام احمد نے اس کی روایات کو موضوع بتایا ہے۔ مبشر بن عبید نے اس حدیث کو حجاج بن ارطاۃ سے روایت کیا ہے۔ حجاج بن ارطاۃ کی روایات بھی محدثین کے نزدیک قابلِ حجت نہیں ہیں۔ ملاحظہ ہو تحفۃ الاحوذی: ۲/۱۸۳۔ دار قطنی مع التعلیق المغنی ص ۳۹۲

مولانا انور شاہ کشمیریؒ فرماتے ہیں کہ امام ترمذی نے حجاج بن ارطاۃ کی کئی جگہ تحسین کی ہے۔ جن وجوہ سے محدثین نے اس کو ضعیف قرار دیا ہے وہ زیادہ اہم نہیں ہیں۔ حدیث کے اس فقرے کو ابن ابی حاتم نے ایک لمبی حدیث کے ذیل میں بھی روایت کیا ہے۔ اس روایت میں یہ دونوں راوی نہیں ہیں۔ حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ یہ روایت میرے نزدیک حسن کے درجے سے کم نہیں ہے۔ فیض الباری: ۴/۲۹۰،۲۹۱۔

[2] مولانا انور شاہ کشمیریؒ فرماتے ہیں کہ قطعِ ید کا نصاب بھی مہر کے نصاب کی طرح عہد رسالت کے آغاز میں بہت کم تھا لیکن بعد میں دس درہم متعین ہوگیا۔ فیض الباری: ۴/۲۹۱

[3] ابن رشد، بدایۃ المجتہد: ۲/۲۰،۱۰۔

سے کم بھی رہی ہے، اس لیے دس درہم اس کا نصاب مقرر کردینا صحیح نہیں ہے۔ ذیل میں اس کی دو مثالیں دی جاتی ہیں۔

۱- حضرت عبد الرحمٰنؓ بن عوف نے ایک انصاری عورت سے شادی کی اور ایک 'نواۃ' سونا اس کا مہر مقرر کیا۔ رسول اللہ ﷺ کو اس کی اطلاع ہوئی تو فرمایا 'بارك الله' ولیمہ کرو، چاہے ایک بکری ہی ذبح کرو۔[1]

'نواۃ' کھجور کی گٹھلی کو کہا جاتا ہے۔ لیکن یہ لفظ پانچ درہم کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔[2]

۲- عامر بن ربیعہ کی روایت ہے کہ ایک شخص نے بنو فزارہ کی ایک عورت سے شادی کی اور مہر میں صرف ایک جوڑا جوتے دیے۔ رسول اللہ ﷺ نے عورت سے پوچھا کہ کیا اس مہر سے تم خوش ہو اور اس کے نکاح میں آنے کے لیے تیار ہو۔ اس نے اثبات میں جواب دیا تو آپ نے اس نکاح کو جائز قرار دیا۔[3]

۳- حضرت جابرؓ کی روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ اگر ایک شخص مہر میں اپنی بیوی کو ایک مٹھی غلہ دے اور وہ اس پر راضی ہو جائے تو نکاح جائز ہے۔[4]

ان میں سے پہلی روایت تو صحاح کی سب ہی کتابوں میں موجود ہے اس لیے اس کی صحت شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ بعد کی روایتوں میں کسی قدر ضعف ہے، لیکن تعیین مہر کے سلسلے میں جو روایات پیش کی جاتی ہیں ان سے وہ بہر حال قوی ہیں۔ علاوہ

---

۱ بخاری، کتاب النکاح، باب الولیمہ ولو بشاۃ۔ مسلم، کتاب النکاح، باب الصداق الخ

۲ ابن الاثیر، النہایہ فی غریب الحدیث: ۱۸۴/۴ 'نواۃ من ذہب' کے معنے میں اختلاف ہے لیکن کسی نے بھی دس درہم اس کے معنے نہیں بتائے ہیں۔ اوپر ہم نے راجح قول کا ذکر کیا ہے۔ ابن حجر، فتح الباری: ۱۸۵/۹، ۱۸۶

۳ مسند احمد: ۴۴۵/۳۔ ترمذی، ابواب النکاح، باب ماجاء فی مہور النساء۔ ابن ماجہ، ابواب النکاح، باب صداق النساء۔

۴ ابوداؤد، کتاب النکاح، باب قلة المہر

ازیں ان کی تائید بعض دوسری روایات سے بھی ہوتی ہے، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ فریقین کو اس بات کا اختیار ہے کہ وہ کم یا زیادہ مہر مقرر کریں، وہ جس مقدار پر بھی متفق ہو جائیں صحیح ہے۔ چاہے وہ بہت ہی حقیر اور معمولی کیوں نہ ہو[1]۔

حقیقت یہ ہے کہ شریعت نے مہر کی مقدار متعین نہیں کی ہے، بلکہ اس کو ہر دور کے حالات، زوجین کی معاشی و سماجی حیثیت ان کی خاندانی روایات، باہمی تعلقات، آپس کے اعتماد اور عورت کی ضروریات پر چھوڑ دیا ہے۔ وہ چاہیں تو کم سے کم مہر بھی طے کر سکتے ہیں اور اس کی بھی انھیں اجازت ہے کہ وہ اپنے حالات کے تحت اس کی مقدار زیادہ رکھیں۔ قرآن مجید سے بھی یہی رہ نمائی ہمیں ملتی ہے۔ ایک جگہ فرمایا:

فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ وَ اٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ (النساء: ۲۵)

ان کے مالکوں کی اجازت سے ان سے نکاح کرو اور دستور کے مطابق ان کے مہر دو۔

یہاں 'اجور' کے معنے مہر لیے گئے ہیں اور اس کو معروف کا پابند بنایا گیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ آیت میں آزاد عورتوں کے مہر کا ذکر نہیں بلکہ لونڈیوں کے مہر کا ذکر ہے اور ہمارے علماء کی اکثریت کی رائے میں لونڈیاں اپنے مہر کی مالک نہیں ہوتیں، بلکہ ان کے آقا اس کے مالک ہوتے ہیں لیکن اس سے اتنی بات ضرور معلوم ہوتی ہے کہ شریعت 'مہر' کے معاملے کو معروف کے حوالے کرنا چاہتی ہے۔ 'معروف' سے مراد یہاں کسی بھی زمانے کا وہ رسم و رواج ہے جس کو عام طور سے پسندیدہ نظر سے دیکھا جائے اور جو شریعت کے کسی واضح حکم یا اس کے مزاج سے نہ ٹکرائے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مہر کی جس مقدار کو معقول اور مناسب سمجھا جائے اور اس کے نامناسب ہونے کا احساس نہ پایا جائے وہی صحیح مہر ہے۔ اس میں عورت اور مرد دونوں کی حیثیت کی بھی رعایت ہونی چاہیے اور زمانہ اور حالات کی بھی۔ ورنہ وہ اچھی نظر سے نہیں دیکھا جائے گا۔

---

[1] اس سلسلے کی کئی روایتیں دارِ قطنی میں موجود ہیں۔ (کتاب النکاح، باب المہر ص ۳۹۱-۳۹۲) لیکن ان سب روایتوں میں ضعف پایا جاتا ہے۔

مہر کے سلسلے میں ایک بحث یہ بھی رہی ہے کہ 'مال' کا اطلاق کن چیزوں پر ہوتا ہے۔ احناف کے نزدیک اس کا اطلاق نقد پر ہوتا ہے، یا ان چیزوں پر جو اپنی مالیت رکھتے ہیں۔ منافع کے لیے وہ بولا نہیں جاتا۔ ابو بکر جصاص کہتے ہیں کہ اَنۡ تَبۡتَغُوۡا بِاَمۡوَالِکُمۡ (اپنے مالوں کے ذریعہ ان کو طلب کرو) سے صریح طور پر دو باتیں نکلتی ہیں۔ ایک یہ کہ مہر وہی چیز ہوگی جس کو مال کہا جاسکے اور عورت جس کی مالک بن سکے۔ دوسرے یہ کہ مہر کو عورت کے حوالے کیا جانا چاہیے، تاکہ وہ اس سے فائدہ اٹھا سکے۔ 'منافع' میں یہ دونوں باتیں ناممکن ہیں۔ نہ تو اس کو عورت کے حوالے کیا جاتا ہے اور نہ وہ اس کی مالک ہی ہوتی ہے۔ مہر سے متعلق قرآن کی ایک اور آیت ہے۔

وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحۡلَةً ؕ فَاِنۡ طِبۡنَ لَكُمۡ عَنۡ شَىۡءٍ مِّنۡهُ نَفۡسًا فَكُلُوۡهُ هَنِيۡٓـئًا مَّرِیۡٓـئًا ○ (النساء:۴)

عورتوں کو ان کے مہر بہ خوشی دو۔ پھر اگر خوش دلی سے وہ اس میں سے کچھ چھوڑ دیں تو تم مزے سے کھا سکتے ہو۔

'عورتوں کو ان کے مہر دو' کے الفاظ بتاتے ہیں کہ مہر دینے کا مطلب عورت کو کسی بھی نوعیت کا فائدہ پہنچانا نہیں ہے بلکہ کسی مادی چیز کا دینا ہے۔ فائدہ پہنچانے کو دینا نہیں کہا جائے گا۔ پھر (تم مزے سے کھا سکتے ہو) کے الفاظ مزید وضاحت کر رہے ہیں کہ 'مہر' کوئی ایسی چیز ہونی چاہیے جو کھائی جاسکے، یا جس سے کھائی جانے والی چیز حاصل کی جاسکے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی شخص اپنی بیوی کا مہر یہ مقرر کرے کہ وہ اس کو قرآن کی تعلیم دے دے گا تو یہ مہر صحیح نہ ہوگا۔[۱] ویسے بھی متقدمین احناف کے نزدیک قرآن کی تعلیم پر اجرت لینا یا منافع حاصل کرنا صحیح نہیں ہے۔[۲]

امام شافعی فرماتے ہیں کہ قرآن کی تعلیم پر اجرت بھی لی جاسکتی ہے اور وہ مہر بھی بن سکتی ہے۔[۳] ان کی دلیل وہ حدیث ہے جو اوپر گزر چکی ہے جس میں آپ نے فرمایا:

---

۱ جصاص، احکام القرآن: ۱۷۳/۲
۲ تفصیلی دلائل کے لیے ملاحظہ ہو، طحاوی: شرح معانی الآثار۔
۳ نووی، شرح مسلم: ۴۵۶/۱

اذهب فقد انکحتها بما معک من القرآن[1]	جاؤ میں نے تمہارا نکاح اس سے کرا دیا ہے، اس قرآن کی وجہ سے جو تمہارے پاس ہے۔

ایک اور روایت ہے۔

فقد زوجتکها فعلمها من القرآن[2]	میں نے تمہارا نکاح اس سے کر دیا تم اس کو قرآن کا کچھ حصہ سکھا دو۔

بعض اور روایتوں میں اس کی تفصیل بھی ملتی ہے کہ تم اتنی آیتوں کی اسے تعلیم دے دو۔ متاخرینِ احناف نے ان دونوں باتوں میں امام شافعی رحمہ اللہ کا مسلک قبول کرلیا ہے۔ وہ تعلیم قرآن پر اجرت لینا بھی صحیح سمجھتے ہیں اور اسے بہ طور مہر طے کرنا بھی ان کے نزدیک صحیح ہے[3] اس طرح یہ مسئلہ علماء کے درمیان بڑی حد تک متفق علیہ بن گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مہر نقد بھی ہوسکتا ہے، باغ، مکان یا کوئی قیمتی چیز بھی ہوسکتی ہے اور عورت چاہے تو یہ بھی طے کرسکتی ہے کہ اسے بجائے مالیت رکھنے والی اس طرح کی چیزوں کے تعلیم دلادی جائے، یا کوئی پیشہ سکھا دیا جائے۔

مطلقہ کا مہر

مہر کے بعض احکام کا تعلق طلاق سے بھی ہے۔ ذیل میں اس کی تھوڑی سی تفصیل پیش کی جا رہی ہے۔ طلاق یا تو خلوت صحیحہ کے بعد ہوگی یا خلوت صحیحہ سے پہلے۔ دونوں صورتوں میں یا تو مہر متعین ہوگا، یا نہیں ہوگا۔ اس طرح طلاق چار مختلف حالتوں میں ہوسکتی ہے[4] ان سب کے احکام الگ ہیں۔

---

۱ بخاری، کتاب النکاح، باب التزویج علی القرآن وبغیر صداق

۲ مسلم، کتاب النکاح، باب الصداق وجواز کونہ تعلیم القرآن الخ

۳ رد المحتار علی الدر المختار: ۲/۴۵۹

۴ حوالہ سابق ۲/۴۶۳۔ نیز ملاحظہ ہو شرح وقایہ: ۲/۳۸-۳۹

۱- طلاق خلوت صحیحہ کے بعد دی جائے اور مہر متعین ہو تو پورا مہر ادا کرنا ہوگا۔

ارشاد ہے۔

وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحۡلَةً ؕ (النساء:۴)	عورتوں کو ان کے مہر عطیہ کے طور پر دو۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:

وَلَا يَحِلُّ لَكُمۡ اَنۡ تَاۡخُذُوۡا مِمَّا اٰتَيۡتُمُوۡهُنَّ شَيۡـئًا ؕ (البقرہ:۲۲۹)	تمہارے لیے جائز نہیں ہے کہ جو (مہر) تم نے ان کو دیا ہے اس میں سے کچھ لے لو۔

۲- طلاق خلوت صحیحہ کے بعد دی جائے اور مہر متعین نہ ہو تو مہر بہر حال دینا ہوگا اس لیے کہ عورت سے استمتاع کے بعد مہر لازم ہو جاتا ہے۔

فَمَا اسۡتَمۡتَعۡتُمۡ بِهٖ مِنۡهُنَّ فَاٰتُوۡهُنَّ اُجُوۡرَهُنَّ فَرِيۡضَةً ؕ (نساء:۲۴)	پھر ان میں سے جن عورتوں سے تم نے فائدہ اٹھایا ان کے مہر انھیں دو، جو تم پر فرض ہیں۔

مہر کی مقدار متعین نہ ہو تو میاں بیوی باہم رضا مندی سے اس کی مقدار متعین کر سکتے ہیں۔ اگر ان میں اختلاف ہو تو مہرِ مثل واجب ہوگا۔ یعنی اس عورت کے خاندان کی دوسری عورتوں کا جو مہر ہوگا وہی اس کا مہر ہوگا[1]

امام رازی فرماتے ہیں کہ اس کی عقلی دلیل یہ ہے کہ شبہ میں کسی عورت سے ہم بستری ہو جائے تو مہر مثل واجب ہوتا ہے۔ اس بنیاد پر جس عورت سے باقاعدہ نکاح ہو بدرجۂ اولیٰ اس کا مہر مثل واجب ہونا چاہیے[2]

۳- خلوت صحیحہ سے پہلے طلاق دی گئی لیکن مہر متعین ہو چکا تھا تو اس صورت میں نصف مہر دیا جائے گا۔ قرآن نے اس کی صراحت کی ہے۔

---

[1] رد المحتار علی الدر المختار: ۴۶۰/۲

[2] تفسیر کبیر ۲۸۲/۲

وَاِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ وَ قَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ اِلَّآ اَنْ يَّعْفُوْنَ اَوْ يَعْفُوَ الَّذِىْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ ۭ وَ اَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۭ وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝ (البقرہ:۲۳۷)

اگر تم نے ان کو ہاتھ لگانے سے پہلے طلاق دی اور تم ان کا مہر مقرر کر چکے تھے تو جو مہر مقرر کیا تھا اس کا آدھا ہوگا۔ ہاں اگر وہ درگزر کریں (اور اس سے کم لیں) یا وہ شخص جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے (یعنی شوہر) درگزر کرے اور زیادہ دے تو یہ بھی صحیح ہے) اگر تم عفو و درگزر سے کام لو تو یہ تقویٰ سے زیادہ قریب بات ہوگی۔ آپس میں احسان کرنا نہ بھولو۔ بے شک جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اسے دیکھتا ہے۔

۴۔خلوت صحیحہ سے پہلے طلاق دی گئی لیکن مہر متعین نہیں تھا تو عورت کو 'متاع' دیا جائے گا۔ قرآن نے اس کے مہر کا ذکر نہیں کیا ہے۔

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مَا لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ اَوْ تَفْرِضُوْا لَهُنَّ فَرِيْضَةً ښ وَ مَتِّعُوْهُنَّ ۚ عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَ عَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ ۚ مَتَاعًا بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ ۝

(البقرہ:۲۳۶)

اس میں تم پر کوئی گناہ نہیں کہ تم نے عورتوں کو اس وقت طلاق دی جب کہ ابھی تم نے نہ تو ان کو ہاتھ لگایا اور نہ ان کا مہر مقرر کیا۔ اس صورت میں ان کو کچھ متاع دو۔ صاحب حیثیت اپنی حیثیت کے مطابق اور تنگ دست اپنی حیثیت کے مطابق۔ متاع معروف کے مطابق ہو۔ احسان کرنے والوں پر یہ لازم ہے۔

ان چار صورتوں کے علاوہ ایک اور صورت بھی ہے۔ وہ یہ کہ خلوتِ صحیحہ سے پہلے مرد کا انتقال ہوگیا اور مہر بھی متعین نہیں تھا تو امام مالک اور امام اوزاعی وغیرہ کی رائے یہ ہے کہ اس عورت کو مہر نہیں ملے گا۔ متعہ دیا جائے گا۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ بیوی سے شوہر جو جنسی تعلق قائم کرتا ہے مہر اس کا عوض ہے۔ جب یہ تعلق ہی قائم نہیں ہوا تو مہر کا سوال نہیں پیدا ہوتا۔ البتہ اسے شوہر کے مال میں میراث ملے گی۔ امام شافعی

کی بھی معروف رائے یہی ہے۔

لیکن امام ابو حنیفہ اور امام احمد وغیرہ کی رائے یہ ہے کہ عورت کو مہر مثل ملے گا اور میراث بھی ملے گی۔ اس کی تائید ایک حدیث سے ہوتی ہے۔ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ سے اسی مسئلہ میں سوال کیا گیا کہ ایک آدمی کا انتقال ہوگیا۔ اس نے بیوی کا نہ تو مہر مقرر کیا تھا اور نہ اس کے ساتھ اس کی خلوت ہوئی تھی۔ آپ نے جواب دیا کہ اس کا مہر وہ ہوگا جو اس کے خاندان کی دوسری عورتوں کا مہر ہے۔ نہ کم نہ زیادہ۔ اسے عدت بھی پوری کرنی ہوگی۔ اسے میراث بھی ملے گی۔ معقل بن سنان اشجعیؓ نے حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کے اس فتویٰ کی تائید میں فرمایا کہ ہمارے قبیلہ کی ایک عورت بروع بنت ورشق کا یہی معاملہ تھا اور رسول اللہؐ نے بالکل یہی فیصلہ فرمایا تھا۔ یہ سن کر حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ بہت خوش ہوئے۔[1]

اس حدیث پر جرح بھی کی گئی ہے لیکن یہ جرح صحیح نہیں ہے۔ امام شافعیؒ کے شاگرد امام مزنی کہتے ہیں کہ یہ حدیث ثابت ہوجائے تو اس کے مقابلہ میں کسی کی رائے قبول نہیں کی جائے گی۔[2] حدیث چوں کہ صحیح ہے اس لیے امام ابو حنیفہؒ ہی کا مسلک زیادہ قوی معلوم ہوتا ہے۔

اگر خلوت سے پہلے عورت کا انتقال ہو جائے اور مہر متعین نہ ہو تو اس کا بھی فقہ حنفی کی رو سے یہی حکم ہے۔[3]

عورت کو مہر میں تصرف کا حق ہے

قرآن مجید نے ایک طرف تو صراحت کے ساتھ کہا کہ مہر عورت کا حق ہے،

---

[1] ترمذی، ابواب النکاح، باب ماجاء فی الرجل یتزوج المرأۃ الخ ابو داؤد، کتاب النکاح، باب من تزوج ولم یسم صداقا حتی مات

[2] بدایۃ المجتہد: ۲/۲۹

[3] رد المحتار علی الدر المختار: ۲/۴۶۰

پہلے اس کے اس حق کو تسلیم کیا جائے۔ اس کے بعد وہ چاہے تو اپنا یہ حق پورا پورا بھی وصول کر سکتی ہے، اس سے کچھ کم بھی لے سکتی ہے اور اسے معاف بھی کر سکتی ہے، دوسری طرف مرد سے کہا کہ اگر عورت بہ خوشی اپنے مہر کا کچھ حصہ واپس کردے تو بڑے شوق سے تم اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہو۔ اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ ارشاد ہے۔

فَاِنۡ طِبۡنَ لَكُمۡ عَنۡ شَىۡءٍ مِّنۡهُ نَفۡسًا فَكُلُوۡهُ هَنِيۡٓــًٔا مَّرِيۡٓــــًٔا○ (النساء:۴)

اگر وہ بہ خوشی اس میں سے کچھ چھوڑ دیں تو تم مزے سے اسے کھا سکتے ہو۔

اس آیت نے یہ بات پوری طرح واضح کردی کہ مہر عورت کی ملکیت ہے۔ اسے اس سے دست بردار ہونے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ وہ اپنی ملکیت میں آزادی سے تصرف کر سکتی ہے۔ اگر وہ بہ طیب خاطر اس میں سے کچھ دے تو شوہر اس سے استفادہ کر سکتا ہے۔ لیکن اگر وہ اس کے جبر کی وجہ سے یا اس کے ظلم وستم سے ڈر کر اسے دے رہی ہے تو اس سے فائدہ اٹھانا صحیح نہیں ہے۔ بعض علماء نے یہاں تک لکھا ہے کہ عورت مہر معاف کردے اور بعد میں اس سے رجوع کرنا چاہے تو کر سکتی ہے۔ اس لیے کہ یہ اس بات کی علامت ہے کہ اس نے خوش دلی سے یہ اقدام نہیں کیا تھا[1]

شعبی کہتے ہیں کہ قاضی شریح کے پاس ایک عورت آئی۔ اس کے ساتھ اس کا شوہر بھی تھا، عورت نے شوہر کو ایک عطیہ دیا تھا اب وہ اسے وہ واپس لینا چاہ رہی تھی۔ قاضی شریح نے شوہر سے کہا کہ اسے واپس کردو۔ شوہر نے مذکورہ بالا آیت کا حوالہ دے کر کہا کہ عطیہ دینے کے بعد اسے واپس لینے کا حق نہیں ہے۔ قاضی شریح نے کہا کہ قرآن نے تو یہ کہا ہے کہ وہ خوش دلی سے دے تو تم لو۔ اگر وہ خوش دِلی سے دیتی تو واپس نہ مانگتی۔

حضرت عمرؓ کے بارے میں آتا ہے کہ انھوں نے قاضیوں کو لکھا کہ عورتیں رغبت سے بھی اور خوف سے بھی (مہر) واپس دے دیتی ہیں۔ اگر عورت مہر دینے کے

---

[1] تفسیر کبیر: ۳/۱۴۶

بعد پھر رجوع کرنا چاہے تو اسے اس کا حق حاصل ہوگا۔[۱]

ویسے فقہا اربعہ اسے صحیح نہیں سمجھتے کہ زوجین میں سے کوئی دوسرے کو عطیہ دینے کے بعد اسے واپس لے[۲] لیکن یہ ایک قانونی بحث ہے۔ اتنی بات طے ہے کہ عورت جو بھی دے، خوش دلی سے دے، اس میں جبر واکراہ صحیح نہیں ہے۔

ایک دوسری جگہ فرمایا:

وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا تَرَاضَيْتُم بِهِ مِنۢ بَعْدِ الْفَرِيضَةِ ۚ (النساء:۲۴)

اس بات میں کوئی گناہ نہیں ہے کہ مہر کے مقرر ہونے کے بعد تم آپس کی رضا مندی سے اس کے بارے میں کوئی چیز طے کرلو۔

عورت اور مرد کی رضا مندی سے مہر میں کمی بھی ہوسکتی ہے اور زیادتی بھی، ادائیگی میں عجلت بھی ہوسکتی ہے اور تاخیر بھی۔ معافی بھی ہوسکتی ہے اور تبدیلی بھی۔ مثلاً مہر میں باغ متعین تھا، اس کی جگہ مکان لے لیا۔[۳]

ان سب باتوں کا تعلق میاں بیوی کے روابط، دونوں کے ایک دوسرے پر اعتماد اور ان کے حالات پر ہے۔ اسی وجہ سے قرآن مجید نے اسے ان کی رضا مندی پر چھوڑ دیا۔ ایک فرض کی ادائیگی میں اس سہولت اور گنجائش کی وجہ سے معاشرتی زندگی میں جو خوش گوار فضا پیدا ہوتی ہے اس کا اندازہ کرنا مشکل نہیں ہے۔

۱۔ حوالہ سابق

۲۔ ابن ہبیرہ، الافصاح: ۲/۵۹

۳۔ مہر کی زیادتی کے بارے میں امام شافعی کو اختلاف ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔ جصاص، احکام القرآن: ۲/۱۶۹-۱۸۹

تعدّدِ ازواج

اسلام کے نزدیک تعدد ازواج (Polygamy) غلط اور ناجائز نہیں ہے۔ اسے وہ بعض شرائط کے ساتھ جائز سمجھتا ہے۔ اس پر اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ انسان کی فطرت وحدتِ ازواج (Monogamy) کا تقاضا کرتی ہے۔ یہ اس کی فطرت کے خلاف ہے کہ وہ بیک وقت کئی کئی بیویاں رکھے۔ یہ عورت کے ساتھ بہت بڑی زیادتی بھی ہے کہ آدمی ایک بیوی کی موجودگی میں دوسری کو اپنے گھر لے آئے اور وہ اس کی حریف اور مدِّ مقابل کی حیثیت سے زندگی بھر اس کے ساتھ لگی رہے۔ چناں چہ بہت سے ممالک نے اس 'ظلم و زیادتی' کو روکنے کے لیے تعدد ازواج پر قانونی پابندی عائد کر رکھی ہے۔ بعض ممالک میں اس پر قانونی پابندی تو نہیں ہے لیکن اسے اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔ اس وقت شاید کم ہی ملک ایسے ہوں گے جہاں اس میں قانونی اور اخلاقی طور پر کوئی قباحت نہ محسوس کی جاتی ہو۔

تعدد ازواج کے مسئلہ میں پہلے تو یہ عرض کرنے کو جی چاہتا ہے کہ اس کے لیے صرف اسلام کو ہدفِ تنقید بنانا صحیح نہیں ہے اس لیے کہ یہ کوئی جرم ہے تو اس کا ارتکاب صرف اسلام ہی نہیں دیگر مذاہب اور اقوام نے بھی کیا ہے۔ اسلام سے پہلے دنیا کی بیشتر قوموں میں اس کا رواج تھا۔ مختلف مذاہب کی قانونی سند اور اخلاقی جواز اسے

حاصل تھا اور اسے کوئی جرم یا گناہ نہیں سمجھا جاتا تھا۔ البتہ راہبانہ مذاہب میں تعدد ازواج کیا معنی ازدواجی زندگی ہی کو ناپسندیدہ تصور کیا جاتا تھا، عیسائیت کا فروغ ایک راہبانہ مذہب کی حیثیت سے ہوا۔ یہاں دین دار آدمی کے لیے ایک بیوی کی بھی بدرجہ مجبوری اجازت تھی۔ مغرب اپنی بے دینی اور الحاد کے دعویٰ کے باوجود عیسائیت کے اثر سے آزاد نہیں ہوا۔ اس نے ایک زوجگی کے تصور کو تو گوارا کرلیا لیکن تعدد ازواج کا تصور اس کے حلق سے نیچے نہیں اتر سکا۔ جن قوموں کی گردن میں مغرب کا طوقِ غلامی تھا انھوں نے اس کی تائید اس طرح کرنی شروع کردی جیسے پہلی مرتبہ آنکھیں کھلی ہوں اور عورت کی عظمت کا احساس ہوا ہو۔

تعدد ازواج کی طرف مرد کا رجحان

پہلے اسے آپ ایک مرد کے نقطۂ نظر سے دیکھیے۔ اس میں شک نہیں کہ عام طور پر ایک مرد ایک ہی بیوی رکھتا ہے۔ لیکن تعدد ازواج کو اس کی فطرت کے خلاف وہی لوگ کہہ سکتے ہیں، جنھوں نے فطرت کا مطالعہ بھی مغرب کی عینک سے کیا ہو۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ مرد کے اندر فطری طور پر ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کا رجحان ہے۔ وہ اگر ایک بیوی پر قانع بھی رہے تو یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس کے اندر اس کی خواہش نہیں ہے۔ جن لوگوں کے اندر اس کا شدید رجحان ہے اگر تعدد ازواج کی اجازت نہ ہو تو، اندیشہ ہے کہ وہ کسی غلط اور ناجائز طریقہ سے اس کی تسکین کا سامان ڈھونڈنے لگیں گے۔ چناں چہ مغرب کا تجربہ ہمارے سامنے ہے۔ اس نے تعدد ازواج کو رد کیا تو زنا اور بے ضابطہ جنسی تعلق کو اسے برداشت کرنا پڑا۔ آج وہاں قانوناً آدمی کی ایک ہی بیوی ہے لیکن داشتائیں بہت ہیں اور وہ ان تمام حقوق سے محروم ہیں جو ایک بیوی کو ازروئے قانون حاصل ہیں۔

تعدد ازواج مرد کی ایک ضرورت

تعدد ازواج کی طرف مرد کا رجحان ہی نہیں بلکہ بعض اوقات یہ اس کی ایک ضرورت بھی بن جاتا ہے۔ جنسی خواہش ایک فطری خواہش ہے۔ جن افراد میں یہ خواہش بڑھی ہوئی ہوتی ہے اور جو اس پر قابو نہیں پاتے ان کے لیے ایک عورت کافی نہیں ہوتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عورت حیض، نفاس، حمل اور رضاعت سے مسلسل گزرتی رہتی ہے۔ ان حالات میں اس کے جنسی جذبات کم زور پڑ جاتے ہیں اور وہ مرد کے جذبات کا پوری طرح ساتھ نہیں دے سکتی۔ اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ ان ایام میں جنسی تعلق رکھنے میں بعض قباحتیں بھی ہیں۔ حیض اور نفاس کی حالت میں آدمی اس سے کراہت محسوس کرتا ہے اور یہ میاں بیوی کی صحت کے لیے بھی نقصان دہ ہے۔ مدتِ حمل میں یہ تعلق بچہ کے لیے ضرر رساں ہے اور تجربہ بتاتا ہے کہ عورت اور مرد کا یہ جذباتی عمل بچہ کے اخلاق و عادات پر بھی برا اثر ڈالتا ہے۔

حمل، بچہ کی ولادت اور رضاعت کی وجہ سے عورت کا نظامِ جسمانی بہت متاثر ہوتا ہے اور عورت جلد بوڑھی ہوتی چلی جاتی ہے، جب کہ اس کے مقابلے میں مرد دیر تک جوان رہتا ہے۔ ان وجوہ سے اگر کوئی شخص ایک بیوی پر قانع نہیں ہے اور دوسری شادی کرنا چاہتا ہے تو اسے ہم غلط نہیں کہہ سکتے۔ ہاں اس پر ضرور یہ پابندی عائد کی جانی چاہیے کہ وہ دونوں کے حقوق ادا کرے اور ان میں سے کسی کی حق تلفی نہ کرے۔

عورت کے لیے تعدد ازواج کی افادیت

اب آپ اسے ایک عورت کے نقطہ نظر سے دیکھئے۔ بعض اوقات تعدد ازواج خود عورت کے حق میں بھی مفید ہوسکتا ہے۔

۱- انسان کے اندر اولاد کی خواہش بالکل فطری ہے۔ اگر کسی شخص کی بیوی بانجھ ہو اور اس سے اولاد نہ ہو رہی ہو تو اس کے سامنے دو ہی صورتیں رہ جاتی ہیں۔ ایک یہ

کہ وہ پہلی بیوی کے ساتھ ایک اور بیوی بھی رکھ لے۔ دوسری یہ کہ وہ پہلی کو طلاق دے کر دوسری سے شادی کرلے۔ ظاہر ہے شاذ و نادر ہی کوئی عورت پہلی صورت کے مقابلہ میں دوسری کو ترجیح دے گی۔

۲- عورت دائم المریض ہو یا کسی ایسے نسوانی مرض میں مبتلا ہو کہ اس کی وجہ سے ازدواجی تعلق رکھنا مشکل ہو تو اس صورت میں کیا یہ بات اس کے حق میں مفید ہوگی کہ اسے طلاق دے کر مرد دوسری صحت مند عورت سے شادی کرلے یا یہ بات کہ وہ اسے اپنے حبالۂ عقد میں رکھتے ہوئے دوسری سے نکاح کرلے؟

اس طرح کی صورتوں میں پہلی بیوی کے ساتھ یہ بڑی زیادتی ہوگی کہ شوہر کو اسے طلاق دینے پر قانوناً مجبور کیا جائے۔ یہ زیادتی اس وقت اور گھناؤنی ہوجاتی ہے جب کہ وہ شوہر کے ساتھ رہنے کے لیے تیار ہو اور شوہر بھی اسے چھوڑنا نہ چاہتا ہو۔

تعدد ازواج، ایک سماجی ضرورت کی حیثیت سے

بعض حالات میں تعدد ازواج سماج کی بھی ایک ضرورت بن جاتی ہے۔

۱- عام طور پر مردوں اور عورتوں کی تعداد برابر ہوتی ہے، لیکن جب کسی قوم کو جنگ سے سابقہ پیش آتا ہے تو زیادہ تر اس کے مرد ہی کام آتے ہیں اور وہ بھی جواں سال اور صحت مند۔ اس سے عورتوں کا تناسب بڑھ جاتا ہے۔ جوان عورتیں بیوہ ہوجاتی ہیں اور جو بے شادی شدہ ہوتی ہیں ان کے لیے مرد نہیں ملتے۔ اس کا ایک حل تو یہ ہے کہ جو عورتیں بیوہ یا بے شادی شدہ ہیں ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ یہ صورت بڑی خطرناک ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی جنسی خواہش غلط طریقے سے پوری کرنے پر مجبور ہوں اور ہوس پرستوں کا بہ آسانی شکار ہوجائیں۔ اس سے پورے معاشرہ میں بدکاری پھیلے گی اور اس کے خطرناک نتائج کا اسے سامنا کرنا پڑے گا۔ اسے کوئی صالح معاشرہ برداشت نہیں کرسکتا۔

۲- قوموں کی زندگی میں افرادی قوت (Man Power) اہم کردار ادا کرتی ہے۔ دفاع کے لیے، صنعتی و زراعتی پیدا وار اور اس کی ترقی کے لیے سماجی و معاشرتی خدمات کے لیے اس کی بنیادی اہمیت ہے۔ بعض خاص اور نازک حالات میں اس کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔ افرادی قوت میں اضافہ کا ایک ذریعہ تعدد ازواج بھی ہے۔ اس لیے کہ عورت بالعموم چالیس پینتالیس سال کے بعد اولاد پیدا کرنے کے قابل نہیں رہتی، جب کہ مرد ستر(۷۰) سال کے بعد بھی اس قابل ہوتا ہے کہ عورت اس سے بار آور ہوسکے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ پہلی بیوی کی جب اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت ختم ہوجائے اس وقت اگر کوئی شخص دوسری سے شادی کرلے تو پھر سے اولاد کا سلسلہ شروع ہوسکتا ہے۔ چناں چہ جن قوموں کو افرادی قوت کی ضرورت ہوتی ہے انھیں تعدد ازواج کی ہمت افزائی کرنی پڑتی ہے۔

عورت ایک سے زیادہ شوہروں کی متحمل نہیں ہے

بعض لوگ کہہ سکتے ہیں کہ اگر ایک مرد کو کئی بیویاں رکھنے کا حق ہے تو عورت کو بھی یہ حق ملنا چاہیے کہ وہ ایک سے زائد شوہر رکھے۔ لیکن یہ مطالبہ برائے مطالبہ ہے۔ واقعات کی دنیا سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس لیے کہ عورت کو یہ حق دے بھی دیا جائے تو شاید وہ اسے استعمال کرنے کی کبھی ہمت نہیں کرسکتی۔

ایک عورت کے کئی شوہروں (Polyandry) کا رواج بعض غیر متمدن قبائل میں تو ہے لیکن متمدن دنیا نے اسے کبھی اختیار نہیں کیا۔ متمدن انسانی سماج نے اسے اس طرح رد کر دیا ہے کہ اب اسے وہ کبھی قبول نہیں کرسکتا۔

عورت کی فطرت بتاتی ہے کہ وہ ایک وقت میں ایک ہی شوہر کی بیوی ہوسکتی ہے۔ چند شوہری اس کی فطرت کے خلاف ہے۔

عورت پر خاندانی ذمہ داریوں کا بوجھ ہوتا ہے۔ حمل اور رضاعت کی تکلیفیں

اسے اٹھانی پڑتی ہیں، بعض باہر کے کام انجام دینے پر بھی وہ بسا اوقات مجبور ہوتی ہے اس لیے کئی مردوں کی جنسی خواہش کا پورا کرنا اس کے لیے بہت دشوار ہے۔ اس سے اس کی صحت کے برباد ہونے کا خطرہ ہے۔ اس سے بعض جنسی اور دماغی بیماریاں بھی پیدا ہوسکتی ہیں۔ چناں چہ تجربہ بتاتا ہے کہ جن عورتوں سے ایک سے زیادہ مردوں کا تعلق ہوتا ہے ان میں جنسی بیماریاں عام ہوتی ہیں اور وہ خانگی زندگی کی قوت اور صلاحیت کھوبیٹھتی ہیں۔

ایک عورت کے کئی شوہر ہوں تو اس سے بعض سماجی و معاشرتی مسائل بھی پیدا ہوجاتے ہیں۔

ایک مرد کی کئی عورتیں ہوں اور وہ ان سب سے تعلق رکھے تو سب اس سے بار آور ہوسکتی ہیں۔ اس لیے ان میں سے جس سے بھی اولاد ہوگی اسی کی سمجھی جائے گی۔ لیکن اگر ایک عورت کے کئی شوہر ہوں اور سب اس سے تعلق رکھیں تو ایک وقت میں وہ ان میں سے ایک ہی سے بار آور ہوسکتی ہے، اس لیے یہ فیصلہ نہیں کیا جاسکتا کہ وہ کس سے بار آور ہوئی ہے اور اولاد کس کی ہے؟

اگر یہی بات متعین نہ ہو کہ بچہ کس کا ہے تو سوال یہ ہے کہ وہ کس کی طرف منسوب ہوگا، کون اس کے اخراجات برداشت کرے گا، اس کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری کون لے گا، وہ کس کا وارث اور کون اس کا وارث ہوگا؟ اس طرح کے اور بھی سوالات ہیں جنھیں خاندان کے موجودہ نظام میں، جو مرد کی سربراہی میں قائم ہے، اور جسے دنیا نے خاندان کی صحیح شکل کی حیثیت سے قبول کرلیا ہے، کبھی حل نہیں کیا جاسکتا۔

چند شوہری کے نظام سے معاشرہ پر بھی برے اثرات پڑ سکتے ہیں۔

۱- یہ مرد کی فطرت ہے، چاہے وہ کتنا ہی برا کیوں نہ ہو کہ اپنی بیوی کے ساتھ کسی دوسرے کے تعلق کو برداشت نہیں کرسکتا۔ ایک عورت کا کئی افراد سے تعلق ہو تو ان کے درمیان حسد اور رقابت کا جذبہ ابھر آتا ہے اور وہ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے

بن جاتے ہیں اور بعض اوقات اس کے بڑے خوف ناک نتائج بھی دیکھنے میں آتے ہیں۔ ان کی یہ کشمکش خود عورت کے لیے ناقابلِ برداشت اور اس کے سکون کو درہم برہم کرنے والی ہوسکتی ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ یہی دلیل تعدد ازواج کے بھی خلاف جاتی ہے، اس لیے کہ عورت بھی اس بات کو پسند نہیں کرتی کہ اس کے شوہر کے کئی بیویاں ہوں اور اس کی محبت میں سب شریک ہو جائیں۔ بلاشبہ یہ بات صحیح ہے لیکن اس کے باوجود عورت کا ردعمل مرد کے ردِعمل کی طرح زیادہ شدید نہیں ہوتا اور اس کے اتنے سنگین نتائج بھی دیکھنے میں نہیں آتے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ وہ مرد کو ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے میں شعوری یا غیر شعوری طور پر حق بہ جانب تصور کرتی ہے۔

۲- عورت کے اندر اللہ تعالیٰ نے شرم و حیا کا جذبہ رکھا ہے۔ یہ جذبہ بالکل فطری ہے اور خود بہ خود اس کے اندر سے اُبھرتا ہے۔ ہزار کوشش کے باوجود مغرب اسے ختم کرنے میں ابھی تک پوری طرح کامیاب نہیں ہو سکا ہے۔ اس جذبہ کی وجہ سے عورت اپنے جنسی جذبات کا مرد کی طرح آسانی سے اظہار نہیں کرتی بلکہ حتی الوسع انھیں چھپاتی ہے۔ عورت کے اس حجاب کا معاشرہ کو زبردست اخلاقی فائدہ پہنچتا ہے۔ وہ جنسی بے راہ روی کی طرف بے جھجک آگے نہیں بڑھ سکتی۔ ایک سے زیادہ مردوں سے تعلق اس کی اس خوبی کو مجروح کر دیتا ہے اور وہ بتدریج بے حیا ہوتی چلی جاتی ہے، عورت اگر حیا کا لباس اتار دے تو معاشرہ بڑی تیزی سے جنسی آوارگی کی طرف بڑھنے لگتا ہے۔

تعدد ازواج عیاشی کے لیے نہیں ہے

اب آیئے اس اعتراض پر غور کیا جائے کہ تعدد ازواج بھی عیاشی ہی کی ایک صورت ہے، اس سے مرد کو جنسی ہوس رانی اور عیاشی کی کھلی چھوٹ مل جاتی ہے۔ چناں چہ اس کے نتیجہ میں جاگیرداروں اور رئیسوں نے حرم سرائیں بھر لیں اور عورتوں کے جھرمٹ میں زندگی گزاری دی۔ اسلام نے تعدد ازواج کو تسلیم کر کے اسی نظام کی

تائید و توثیق کی ہے اور عیاشی کے دروازے کھول دیے ہیں کہ آدمی جب چاہے جس عورت سے چاہے شادی کرلے اور چار کی گنتی پوری ہوجائے تو ایک کو طلاق دے کر دوسری کو لے آئے۔ جی چاہے تو سب کو خانہ بدر کر کے چار نئی دلہنوں سے عشرت کدہ آباد کرلے۔

یہ اعتراض یک زوجگی کے نظام (Monogamy) پر بھی کیا جاسکتا ہے۔ اگر کوئی شخص چاہے تو ہر فصل بہار میں پرانی بیوی کو رخصت کر کے نئی بیوی لاسکتا ہے۔ بلکہ اس طرح گھر کی رونق بڑھانے کے لیے کسی موسم کے انتظار کی بھی شاید ضرورت نہیں ہے صرف من کی موج کافی ہے۔ لیکن یہ اعتراض وہی شخص کرسکتا ہے جو اس حقیقت سے آنکھیں بند کرلے کہ عیاش آدمی ہمیشہ غیر ذمہ دار ہوتا ہے۔ اسے اپنی عیاشی سے غرض ہوتی ہے۔ وہ کسی قسم کا بوجھ اپنے اوپر لینا نہیں چاہتا۔ چناں چہ جن لوگوں نے عیاشی کی زندگی گزارنی چاہی انھوں نے بے قید شہوت رانی اختیار کی۔ تعدد ازواج کیا معنی ازدواجی زندگی ہی کو ناپسند کیا۔ اگر اسے مارے باندھے اختیار بھی کیا تو کبھی اس کے حقوق ادا نہیں کیے۔ اسلام میں ازدواجی زندگی ذمہ داریوں سے گھری ہوئی ہے۔ تعدد ازدواج سے یہ ذمہ داریاں اور بڑھ جاتی ہیں۔ اس نے اس پر اتنی پابندیاں عاید کی ہیں اور اتنے حدود و قیود رکھے ہیں کہ بغیر کسی حقیقی ضرورت کے آدمی ایک سے زیادہ شادی کی ہمت نہیں کرسکتا۔

تعدد ازواج کا جواز

قرآن مجید نے یتیموں کی نگہ داشت اور ان کے حقوق کی حفاظت کے ذیل میں تعدد ازواج کا ذکر کیا ہے۔ ارشاد ہے۔

وَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تُقْسِطُوا فِي الْيَتٰمٰى فَانْكِحُوا مَا طَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَآءِ	اگر تمھیں ڈر ہو کہ تم یتیموں کے معاملہ میں انصاف نہ کروگے تو تم (ان کے علاوہ) جو عورتیں تمہیں پسند آئیں ان میں سے دو دو،

مَثۡنٰی وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ ۚ فَاِنۡ خِفۡتُمۡ اَلَّا تَعۡدِلُوۡا فَوَاحِدَۃً اَوۡ مَا مَلَکَتۡ اَیۡمَانُکُمۡ ؕ ذٰلِکَ اَدۡنٰۤی اَلَّا تَعُوۡلُوۡا ؕ

(النساء:۴)

تین تین اور چار چار سے نکاح کرلو۔ (اور ان کے ساتھ انصاف کرو) اگر تمھیں ڈر ہو کہ تم ان کے ساتھ انصاف نہ کرسکو گے تو ایک عورت پر اکتفا کرو یا ان لونڈیوں سے فائدہ اٹھاؤ جو تمہاری ملکیت میں ہیں۔ یہ اس بات سے قریب ہے کہ تم (عدل و انصاف پر قائم رہواور) کسی طرف جھک نہ جاؤ۔

اس آیت کے ذیل میں مفسرین نے لکھا ہے اور حدیث سے اس کی تائید ہوتی ہے کہ بعض اوقات یتیم لڑکیوں کے سرپرست ان کے مال یا حسن کی وجہ سے ان سے نکاح کرلیتے اور ان کا مہر ٹھیک سے نہیں ادا کرتے تھے۔ یہ صریح زیادتی تھی۔ اس سے انھیں منع کیا گیا۔ ہاں اگر وہ پورا مہر ادا کریں تو ان سے نکاح کرسکتے تھے۔ ان کے علاوہ دوسری عورتوں سے بھی نکاح کا انھیں حق دیا گیا۔[1]

حقیقت یہ ہے کہ ایک مومن کے دل میں ناانصافی کا احساس لازماً ہوتا ہے۔ اس لیے کہا گیا کہ اگر تمھیں ڈر ہے کہ یتیم لڑکیوں کے ساتھ انصاف نہ ہو سکے گا تو تم ان کو چھوڑ کر دوسری عورتوں سے، جو تمھیں اچھی لگیں اور جن سے نکاح کی شریعت میں ممانعت نہیں ہے، نکاح کرلو۔

اس کا ایک مفہوم یہ بھی بیان ہوا ہے کہ اگر تمہارا خیال ہے کہ تم یتیموں کے ساتھ انصاف نہ کرسکوگے تو ان کی ماؤں سے جن سے نکاح کرنا تمھارے لیے جائز ہے نکاح کرلو۔ اس طرح ان سے انصاف کرنا تمھارے لیے آسان ہوگا۔

اس آیت میں وہ پس منظر بھی بیان ہوا ہے جس میں ایک سے زیادہ نکاح کی اجازت دی گئی ہے اور ان اعتراضات کا جواب بھی ہے جو اس موضوع پر کیے جاتے ہیں۔

---

[1] بخاری، کتاب النکاح، باب الترغیب فی النکاح۔ حق مہر کے ذیل میں اس کا ذکر اس سے پہلے آچکا ہے۔ ملاحظہ ہو: 'مسلمان عورت کے حقوق' کی بحث

قانونی اقدامات

۱-اسلام جو ذہن و مزاج پیدا کرنا چاہتا ہے وہ صحیح معنی میں پیدا ہوجائے تو آدمی جنسی عیاشی کو ایک لمحہ کے لیے برداشت نہیں کرسکتا، اس کا تصور بھی اس کے لیے دشوار ہوگا۔ یہاں اس سے بحث نہیں ہے۔ صرف بعض ان قانونی اقدامات کا ذکر کیا جا رہا ہے جو اسلام نے تعدد ازواج کے سلسلے میں کیے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ اسلام نے تعدد ازواج کے ذریعے عیاشی کی راہ نہیں کھولی ہے بلکہ اس میں زبردست رُکاوٹ پیدا کردی ہے۔

چار کی تحدید

اسلام سے پہلے تعدد ازواج کا عام رواج تھا۔ عرب میں بھی اس پر عمل جاری تھا۔ بعض لوگ بہ کثرت شادیاں کرتے تھے اور اس میں بڑی زیادتیوں کے مرتکب ہوتے تھے۔ اسلام نے اس آیت کے ذریعے اسے چار تک محدود کر دیا۔ وہ تعدد ازواج کو ایک شخصی اور سماجی ضرورت کی حیثیت سے تسلیم تو کرتا ہے لیکن کسی ایسی صورت کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہے جس میں آدمی کو چار سے زیادہ شادیاں کرنی پڑیں۔ اسے وہ ناجائز اور حرام ٹھہراتا ہے۔ جو شخص اس حد سے آگے بڑھے، اسلامی قانون اس کے خلاف اقدام کرے گا۔ اس طرح غیر محدود بیویاں رکھنے کا جو طریقہ رائج تھا اس نے اس پر پابندی لگائی اور ایک حد سے آگے بڑھنے سے روک دیا۔

حکم نہیں صرف اِجازت

۲- بعض لوگ تعدد ازواج کا اس طرح ذکر کرتے ہیں جیسے اسلام نے اسے فرض قرار دے رکھا ہے اور مسلمان اس کے کسی حکم پر عمل کرے یا نہ کرے اس حکم پر ضرور عمل کرتا ہے۔ ایک عورت سے اس کا کبھی جی نہیں بھرتا، اس کا گھر ہمیشہ چار بیویوں سے آباد رہتا ہے۔

اس سلسلہ میں ایک تو یہ عرض کرنا ہے کہ یہ خیال بالکل غلط اور سراسر بے بنیاد ہے کہ سارے مسلمان یا کم از کم ان کی اکثریت تعدد ازواج پر عمل کرتی ہے۔ مسلمانوں کی ہزاروں کی آبادی میں اس پر عمل کرنے والے شاید انگلیوں پر گنے جاسکیں گے۔ یہ صرف قیاس نہیں اعداد وشمار بھی اس مہمل خیال کی صاف تردید کرتے ہیں۔ ان سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ دیگر اقوام کا تناسب اس معاملہ میں مسلمانوں سے بہت زیادہ ہے۔

دوسرے یہ کہ یہ آیت صاف بتاتی ہے کہ تعدد ازواج کی اسلام نے اجازت دی ہے، حکم نہیں دیا ہے۔ اس کا منشاء صرف یہ ہے کہ ضرورت پر اس سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ اس پر زندگی بھر عمل نہ ہو تو بھی آدمی گناہ گار نہ ہوگا اور اس کے تقویٰ اور دین داری میں اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔

تیسرے یہ کہ اس آیت میں اور اسلام کی دوسری تعلیمات میں تعدد ازواج کی نہ تو ہمت افزائی کی گئی ہے اور نہ اس کی ترغیب وتشویق ہی پائی جاتی ہے، بلکہ اس کی پیچیدہ ذمہ داریوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے، تاکہ آدمی سوچ سمجھ کر یہ اقدام کرے۔ اسے محض لذت اور تفریح کا ذریعہ نہ سمجھ بیٹھے۔

چوتھے یہ کہ آیت سے اس غلط خیال کی تردید ہوتی ہے کہ تعدد ازواج عیاشی ہی کے لیے ہوتا ہے۔ یہ ہم دردی کی بھی ایک صورت ہوسکتی ہے۔ چناں چہ یتیموں کے حقوق کی پاس داری کے ذیل میں اس کی اجازت دی گئی ہے۔ اس طرح کی سماجی ضرورتیں اور بھی ہوسکتی ہیں۔ فرض کیجیے کوئی جوان عورت بے شادی شدہ رہ جائے یا بیوہ ہوجائے اور اس کی معاشی ذمہ داری اٹھانے والا بھی کوئی نہ ہو۔ اس کے ساتھ ایک شخص محض اس کی ہم دردی میں دوسری بیوی کی حیثیت سے اس سے نکاح کرلے تو کیا اسے غلط کہا جاسکتا ہے یا اس پر عیاشی کا الزام عاید ہوتا ہے؟

بعض قیود اور شرائط

جو شخص تعدد ازواج کی اجازت سے فائدہ اٹھا کر ایک بیوی کی موجودگی میں دوسری سے شادی کرے، اسلام نے اس پر حسب ذیل پابندیاں عاید کی ہیں۔

۱- وہ مالی لحاظ سے اس حیثیت میں ہو کہ۔

پہلی بیوی کے ساتھ اس کے بھی نان ونفقہ کی ذمہ داری اُٹھائے اور اس کے لیے مکان فراہم کرے۔ بعض فقہاء نے یہ بھی لکھا ہے کہ اگر دوسری بیوی پہلی کے ساتھ نہ رہنا چاہے تو اسے الگ مکان مہیا کرے[1]

۲- وہ جسمانی لحاظ سے اس قابل ہو کہ زن وشو کے تعلقات رکھ سکے۔ اس کی قانونی حیثیت اور اس کے وقفہ کے بارے میں فقہاء نے بحث کی ہے۔ اس سے قطع نظر نکاح کا ایک مقصد عفت وعصمت کا تحفظ ہے، اس لیے بہت سے فقہاء نے لکھا ہے کہ یہ وقفہ چار ماہ سے زیادہ نہیں ہونا چاہیے۔ اس کی تائید حضرت عمرؓ کے دور کے ایک فیصلہ سے بھی ہوتی ہے[2]

امام ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ آدمی کو معروف کے مطابق بیوی سے ہم بستری کرنی چاہیے۔ یہ اس کے کھانے پینے کے نظم سے زیادہ اہم ہے۔ مزید فرماتے ہیں کہ بعض لوگوں کے نزدیک چار ماہ میں کم از کم ایک مرتبہ ہم بستری واجب ہے۔ بعض دوسرے لوگوں نے کہا ہے کہ اس کا انحصار عورت کی ضرورت اور مرد کی طاقت پر ہے۔ یہی بات صحیح معلوم ہوتی ہے[3]

علامہ ابن عربی مالکی کہتے ہیں:

۱۔ رد المحتار علی الدر المختار: ۲/۹۱۲، ۹۱۳

۲۔ ملاحظہ ہو، المغنی لابن قدامہ: ۷/۳۰-۳۱ رد المحتار علی الدر المختار ۲-۵۴۶-۵۴۷

۳۔ فتاویٰ ابن تیمیہ: ۳۲/۲۷۱ مطبوعہ ۱۳۹۸ھ

اذا قدر الرجل من مالہٖ و من بنیته علی نکاح اربع فلیفعل و اذا لم یحتمل ماله ولا بنیته فی الباء ة فلیقتصر علی ما یقدر علیه[۱]	اگر آدمی مالی اور جسمانی لحاظ سے چار شادیوں کی طاقت رکھے تو چار کرے۔ اگر اس کی مالی حالت یا جنسی تعلق کے لیے اس کی جسمانی حالت اس کی متحمل نہ ہو تو اسے صرف اتنی ہی شادیاں کرنی چاہئیں جتنی کی وہ طاقت رکھتا ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص مالی اور جسمانی لحاظ سے اس قابل نہ ہو کہ وہ تعدد ازواج کی اجازت سے فائدہ اٹھا سکے اسے ایک ہی بیوی پر اکتفا کرنا چاہیے۔

۳- اگر آدمی مالی اور جسمانی لحاظ سے دوسری شادی کے قابل ہو تو بھی ضروری ہے کہ وہ دونوں کے درمیان ان تمام امور میں عدل و مساوات برتے جن میں مساوات برتنا عملاً ممکن ہے۔ اس میں نان ونفقہ، لباس، مکان اور شب گزاری آتے ہیں۔ عدل و انصاف اسلام کے نظام معاملات کی جان ہے۔ اس نے اس معاملہ میں عدل کو اس قدر اہمیت دی ہے کہ اگر یہ اندیشہ بھی محسوس ہو کہ بیویوں کے درمیان انصاف نہیں ہو سکتا تو حکم ہے کہ ایک ہی بیوی رکھے۔ فرمایا:

فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً ط (النساء:۳)	اگر تمھیں ڈر ہو کہ تم ان کے ساتھ انصاف نہ کر سکو گے تو ایک ہی نکاح کرو۔

علامہ ابوبکر جصاص حنفی کہتے ہیں کہ اگر کسی کو یہ خوف ہو کہ وہ چار بیویوں کے درمیان عدل قائم نہیں رکھ سکتا تو اسے تین ہی کرنا چاہیے، اگر اندیشہ ہو کہ وہ تین میں بھی عدل نہیں کر سکے گا تو اسے دو ہی کرنا چاہیے اور دو کے درمیان بھی عدل کا یقین نہ ہو تو صرف ایک پر اکتفا کرنا چاہیے[۲]

---

۱ ابن عربی، احکام القرآن: ۱/۱۳۰

۲ جصاص، احکام القرآن: ۲/۶۴

بیویوں کے درمیان عدم انصاف پر حدیث میں سخت وعید آئی ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

اذا كانت عند الرجل امرأتان فلم يعدل بينهما جاء يوم القيامة و شقه ساقط[۱]

جس شخص کی دو بیویاں ہوں اور وہ ان کے درمیان انصاف نہ کرے (اور ایک کی طرف جھک جائے) تو وہ قیامت کے دن اس طرح آئے گا کہ اس کے جسم کا ایک حصہ جھکا ہوا (یعنی مفلوج) ہوگا۔

بیویوں کے درمیان عدل وانصاف کرنا ان امور میں ضروری ہے جو انسان کے اختیار میں ہیں۔ یہ انسان کے اختیار میں نہیں ہے کہ وہ سب سے یکساں محبت کرے، کسی کی طرف دل کا جھکاؤ زیادہ اور کسی کی طرف کم ہوسکتا ہے۔ اسی طرح ہم بستری اور مجامعت میں بھی مساوات ممکن نہیں ہے۔ اس کا تعلق طبیعت کے نشاط اور آمادگی پر ہے۔ یہ آدمی کے بس میں نہیں ہے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں۔

ان النبی ﷺ کان یقسم بین نسائہ فیعدل و یقول اللھم ھٰذا قسمی فی ما املک فلا تلمنی فیما تملک ولا املک[۲]

رسول اللہ ﷺ جو چیزیں تقسیم کی جاسکتی تھیں وہ اپنی بیویوں کے درمیان تقسیم فرماتے اور انصاف کے ساتھ تقسیم فرماتے۔ اس کے بعد فرماتے۔ اے اللہ! جن چیزوں پر مجھے اختیار ہے ان میں یہ تقسیم میں نے کی ہے۔ جن باتوں کا تو مالک ہے اور جو میرے اختیار میں نہیں ہیں (محبت وغیرہ) اس میں کمی بیشی ہو تو اس پر میری گرفت نہ فرما۔

اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ آدمی محبت اور قلبی تعلق کے نام پر کسی کی طرف اس طرح جھک جائے کہ دوسری کے ساتھ ظلم و زیادتی ہونے لگے اور وہ شوہر کے

۱؎ مشکوٰۃ المصابیح، کتاب النکاح، باب القسم بحوالہ ترمذی، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ، دارمی۔

۲؎ مشکوٰۃ المصابیح، کتاب النکاح، باب القسم بحوالہ ترمذی، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ، دارمی۔

ہوتے ہوئے بھی بے شوہر کے زندگی گزارنے پر مجبور ہوجائے۔ قرآن صراحت کے ساتھ اس سے منع کرتا ہے:

وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوْا اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَآءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ فَلاَ تَمِيْلُوْا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوْهَا كَالْمُعَلَّقَةِ ط (النساء:۱۲۹)	تم بیویوں کے درمیان، اگر چاہو تو بھی پورا پورا عدل نہیں کرسکتے پھر بھی کسی ایک کی طرف بالکل جھک نہ جاؤ کہ دوسری کو اُدھر لٹکتا چھوڑ دو۔

۴۔ جس طرح دوسری بیوی کو وہ تمام حقوق حاصل ہوتے ہیں جو پہلی بیوی کو حاصل ہیں اسی طرح اس سے ہونے والے بچوں کو بھی پہلی بیوی کے بچوں کے مساوی حقوق ملیں گے۔ دونوں بیویوں کی اولاد کے درمیان از روئے قانون کوئی فرق نہیں ہوگا۔ ان سب کی ذمہ داری ایک بہت بڑا بوجھ ہے جو تعدد ازواج کی اجازت سے فائدہ اُٹھانے کے بعد آدمی پر عائد ہوتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلامی قانون کی رو سے ایک سے زیادہ بیویاں رکھنا آسان نہیں ہے لیکن بعض شخصی اور سماجی حالات میں تعدد ازواج کی اجازت اس پر پابندی لگانے سے زیادہ مفید ہے۔ اس لیے اسلام نے اس کی اجازت دی ہے۔

طلاق کا مسئلہ

اسلام کے قانونِ طلاق پر ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ اس نے طلاق کا حق مرد کو دے کر عورت کے ساتھ زیادتی کی ہے۔ اس کے لیے کسی معقول وجہ کا پایا جانا بھی ضروری نہیں ہے۔ یہ سراسر ایک طرفہ کارروائی ہے اور مرد کی مرضی پر اس کا انحصار ہے۔ وہ جب چاہے کسی معمولی سی غلطی پر، بلکہ بغیر کسی غلطی کے بھی طلاق کے ذریعہ اسے الگ کرسکتا ہے۔ اس طرح اچانک ایک عورت کا مستقبل تاریک ہو جاتا ہے اور وہ بے سہارا زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔

طلاق کی ضرورت پیش آ سکتی ہے

جس بھیانک شکل میں طلاق کا ذکر کیا جاتا ہے ایک تو یہ کہ مسلم معاشرہ میں اس کا کوئی وجود نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ طلاق بہت سے خانگی جھگڑوں اور پیچیدگیوں کا مناسب اور معقول حل ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ بعض اوقات عورت اور مرد کے لیے مل جل کر ازدواجی زندگی گزارنا مشکل ہو جاتا ہے اور وہ ایک دوسرے سے دامن چھڑانے کی فکر میں لگ جاتے ہیں۔ اس کے مختلف اسباب ہوتے ہیں۔ کبھی دونوں کے مزاج میں مناسبت نہیں ہوتی، ان کے دل ایک دوسرے کو قبول نہیں کرتے، کبھی ان کے درمیان اتنا زیادہ معاشی اور معاشرتی فرق ہوتا ہے کہ اس کا دور کرنا دشوار ہوتا ہے، کبھی دونوں کی فکری اور علمی سطح ایک نہیں ہوتی جس کی وجہ سے جسمانی قربت کے باوجود

ذہنی دوری کا احساس ہوتا ہے، کبھی ایسی اخلاقی کمزوریاں سامنے آتی ہیں کہ آدمی ان کی اصلاح سے مایوس بھی ہوتا ہے اور انھیں برداشت بھی نہیں کرپاتا۔ اس طرح کی صورتوں میں عقل اور سمجھ کا تقاضا یہی ہے کہ دونوں میں علیٰحدگی ہوجائے۔ اگر عیسائیت کی طرح طلاق کی اجازت نہ ہو اور دونوں کو ساتھ رہنے پر مجبور کیا جائے تو اس سے وہ مقاصد ہرگز پورے نہیں ہوتے جن کے لیے ان کے درمیان نکاح ہوا تھا۔ اس کے کئی نقصانات ہیں۔

ایک تو یہ کہ عورت، مرد کے لیے ایک بوجھ بن جائے گی اور وہ اس کے ساتھ بد سے بدتر سلوک کرے گا۔

دوسرے یہ کہ طلاق کے بعد عورت کا کسی ہم مزاج سے رشتہ ہوسکتا ہے اور وہ بہتر زندگی گزار سکتی ہے۔ طلاق کا راستہ بند کردینے کے بعد یہ امکان ختم ہوجائے گا۔

تیسرے یہ کہ اس سے گھر کی زندگی جہنم زار بن جائے گی اور دونوں کا ذہنی سکون ختم ہوجائے گا۔

چوتھے یہ کہ دونوں کی آپس کی کشمکش کی وجہ سے اولاد پر وہ توجہ نہیں دی جاسکے گی جو فی الواقع دی جانی چاہیے۔ اس سے ان کی صحیح تربیت نہ ہوگی اور وہ جھگڑالو ماں باپ کے جھگڑالو بچے بن کر اُبھریں گے۔

طلاق کا حق کسے حاصل ہو؟

اب اس سوال کو لیجیے کہ طلاق کا حق کسے حاصل ہو؟ اس کے تین جواب ہوسکتے ہیں ایک یہ کہ یہ حق دونوں کو حاصل ہو، دوسرا یہ کہ یہ حق مرد کو ملنا چاہیے، تیسرا یہ کہ اسے عورت کے ہاتھ میں ہونا چاہیے۔

پہلی صورت پر عمل کرنے سے صاف بات ہے طلاق کی کثرت ہوگی اور خاندان کے ادارے کو سخت نقصان پہنچے گا۔ اس لیے کہ اگر طلاق کا اختیار عورت اور مرد

میں سے کسی ایک کو ہوتو اس کا استعمال نسبتاً کم ہوگا اور اگر یہ حق دونوں کو مل جائے اور دونوں اسے اپنی آزاد مرضی سے استعمال کریں تو فطری طور پر اس میں زیادتی ہوگی۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جس سوسائٹی میں طلاق کا تناسب کم ہوتا ہے اس کا خاندانی نظم مضبوط ہوتا ہے اور جہاں اس میں اضافہ ہوتا ہے خاندان درہم برہم ہوکر رہ جاتا ہے۔ مغرب نے یہ اختیار دونوں ہی کو دے رکھا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ نکاح ایک مذاق بن گیا ہے، عورت اور مرد میں سے جو چاہے اور جب چاہے اس رشتہ کو توڑ کر اپنی راہ لیتا ہے۔ طلاق کی کثرت سے خاندان اپنی تباہی کا مرثیہ پڑھ رہا ہے۔

دوسری صورت اسلام نے اختیار کی ہے۔ اس نے طلاق کا حق مرد کو دیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ مرد کو خاندان میں برتر حیثیت حاصل ہے۔ وہ قوّام اور نگراں ہے۔ وہ بیوی کی مالی ذمہ داریاں برداشت کرتا ہے، اس کے ساتھ بچوں کی پرورش اور تعلیم و تربیت کا بوجھ اُٹھاتا ہے، اس لیے وہی یہ فیصلہ کرسکتا ہے کہ بیوی کے ساتھ مل کر وہ ان ذمہ داریوں سے سبک دوش ہوسکتا ہے یا نہیں؟ قرآن کے الفاظ میں اسی کے ہاتھ میں عقدۂ نکاح (رشتۂ نکاح کا باندھنا اور ختم کرنا) ہوتا ہے۔ (البقرہ:۲۳۷) یہ اس کے ساتھ بڑی زیادتی ہے کہ جس بیوی کو وہ ناپسند کرے یا جس کا تعاون اسے حاصل نہ ہو اس بیوی کو اپنے گھر کی ملکہ بنائے رکھنے پر اسے مجبور کیا جائے۔

یہ نہیں کہا جاسکتا کہ مرد کو طلاق کا حق مل جائے تو اسے وہ من مانے طریقہ سے استعمال کرنے لگے گا، اس لیے کہ اس میں اس کا زبردست مالی نقصان ہے۔ بیوی کو اس نے جو مہر دیا ہے اس کا وہ مطالبہ نہیں کرسکتا۔ اگر نہیں دیا ہے تو طلاق کے وقت اسے دینا پڑے گا۔ شادی کے زیورات وغیرہ سے بھی وہ محروم ہوجائے گا۔ بیوی اسے لے جائے گی۔ اس مدت میں اس نے بیوی پر جو کچھ خرچ کیا ہے وہ بھی اسے واپس نہیں ملے گا۔ اس کے بعد اگر وہ دوسری شادی کرنا چاہے تو ازسرنو اسے مہر دینا ہوگا، شادی کے اخراجات برداشت کرنے ہوں گے اور اس کی معاشی ذمہ داریاں اٹھانی ہوں گی۔ اس کے ساتھ اگر

پہلی بیوی کے بچے ہوں تو ان کی کفالت بھی اسے کرنی ہوگی۔ وہ لوگ خیالی دنیا میں رہتے ہیں جو مرد کے حق طلاق پر اعتراض کرتے ہیں، ان بے چاروں کو زندگی کے ان حقیقی مسائل پر سوچنے کی شاید فرصت ہی نہیں ملتی۔ لیکن جس شخص کے سامنے یہ سارے مسائل ہوں وہ ایک بیوی کو طلاق دے کر دوسری کے ذریعہ گھر آباد کرنے سے پہلے ان پر ضرور سوچے گا اور ہزار بار سوچے گا۔ تخریب کے بعد تعمیر کھیل نہیں ہے۔

اب تیسری صورت کو لیجئے۔ وہ یہ کہ حقِ طلاق عورت کو دیا جائے۔ اس سے طلاق کا غلط اور بے جا استعمال ختم نہ ہوگا۔ مرد حق طلاق کے ناروا استعمال سے عورت کو پریشان کرسکتا ہے تو اس امکان کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ اس حق کے ملنے پر عورت اس کا نامناسب استعمال کر کے مرد کو مصیبت میں ڈال دے۔

عورت کو یہ حق دینے میں بعض قباحتیں بھی ہیں۔

۱- مرد کے ساتھ یہ بہت بڑی زیادتی اور ناانصافی ہے کہ عورت کی ساری ذمہ داریاں مرد اُٹھائے اور حق طلاق عورت کے ہاتھ میں رہے۔

۲- طلاق سے مرد کا نقصان ہے۔ عورت کا کوئی نقصان نہیں ہے۔ اگر طلاق کا اختیار اسے حاصل ہو تو کوئی بھی بد اخلاق عورت جب چاہے مرد کو طلاق دے کر بچوں کو اس کے حوالہ کردے گی اور مہر اور زیورات لے کر گھر سے نکل کھڑی ہوگی۔ پھر نئے مہر اور نئے ساز و سامان کے ساتھ دوسرے مرد سے شادی کرلے گی۔

۳- یہ ایک حقیقت ہے کہ مرد کے مقابلہ میں عورت زیادہ جذباتی ہوتی ہے۔ وہ کسی بھی وقتی جوش اور جذبہ کے تحت مرد سے علیحدگی اختیار کرسکتی ہے۔ اس سے طلاق کا تناسب بہت بڑھ جائے گا اور معاشرہ ایک نئے بحران سے دو چار ہو جائے گا۔

عدالت کے ذریعہ طلاق کی قباحت

اس کا حل یہ سمجھا جاتا ہے کہ عدالت کے ذریعہ طلاق ہو۔ میاں بیوی میں

سے جو بھی الگ ہونا چاہے عدالت سے درخواست کرے۔ اگر عدالت ان اسباب سے مطمئن ہو جو علیٰحدگی کے لیے بیان کیے گئے ہیں تو ان کے درمیان تفریق کردے ورنہ درخواست رد کردی جائے۔

اس میں قباحت یہ ہے کہ زوجین میں سے جو بھی طلاق حاصل کرنا چاہے گا وہ عدالت کو مطمئن کرنے کے لیے فریقِ ثانی کی حقیقی کمزوریاں اور زیادتیاں ہی نہیں بیان کرے گا بلکہ وقتِ ضرورت اس پر سخت سے سخت اور سنگین الزامات بھی عائد کرے گا۔ اس پر یقینی طور پر جوابی الزامات کا سلسلہ شروع ہوجائے گا۔ اس سے دونوں کی سیرت اور اخلاق اس قدر مجروح ہوں گے کہ سوسائٹی میں ان کا وقار باقی نہیں رہے گا اور وہ اپنے ہاتھوں اپنی ہی نہیں پورے خاندان کی رسوائی اور جگ ہنسائی کا سامان کریں گے۔

پھر عدالت کا جو حال ہے اس سے ساری دُنیا واقف ہے۔ وہاں سے کوئی فیصلہ حاصل کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس پوری مدت میں وہ کیسے ایک ساتھ زندگی گزاریں گے بلکہ ایک دوسرے کو برداشت کریں گے۔ اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اگر عدالت سے علیٰحدگی نہ ہو تو میاں بیوی دونوں بہ جبر و اکراہ ایک دوسرے سے بندھے رہیں گے۔ اس سے دونوں کی جان ضیق میں پڑی رہے گی۔ ان کے لیے خوش گوار زندگی کا تصور بھی مشکل ہوگا۔

بعض اخلاقی ہدایات

اسلام انسان کا جو ذہن اور مزاج بناتا ہے اور جس طرح اس کی تربیت کرتا ہے، اس میں طلاق کی نوبت کم ہی آسکتی ہے اور یہ خطرہ بس امکان ہی کے درجہ میں ہوتا ہے کہ آدمی محض جنسی لذت اور حظِ نفس کے لیے طلاق کی تلوار چلاتا پھرے۔ اسلام نے اس سلسلہ میں جو اخلاقی ہدایات دی ہیں ذیل میں ان کا ایک ہلکا سا تصور دیا جارہا ہے۔

نکاح ایک سنجیدہ معاہدہ ہے

اسلام کے نزدیک نکاح کے ذریعہ عورت اور مرد چند دن کے عیش یا تفریح کے لیے نہیں ملتے بلکہ وہ زندگی بھر کی رفاقت کا عہد باندھتے ہیں۔ اس عہد کو قرآن نے 'میثاق غلیظ' سے تعبیر کیا ہے (النساء:۲۱) جو شخص سنجیدگی سے یہ عہد کرے وہ آسانی سے اسے توڑنے کی ہمت نہیں کرسکتا۔ یہ مذاق وہی کرسکتا ہے جو اس کی اہمیت کو نہ محسوس کرتا ہو اور بے شعوری کے عالم میں اتنا بڑا عہد کر بیٹھا ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے نکاح اور طلاق کے معاملہ میں مذاق کو ناروا قرار دیا ہے، اس لیے کہ یہ اس سنجیدگی کے منافی ہے جو اس سلسلہ میں ہونی چاہیے۔ حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا:

ثلاث جِدّھن جدّ و ھزلُھُنَّ جد النکاحُ والطلاقُ والرجعةُ[۱]

تین چیزیں ایسی ہیں کہ ان میں سنجیدگی تو سنجیدگی ہے ہی۔ مذاق بھی سنجیدگی ہی سمجھا جائے گا۔ وہ ہیں نکاح، طلاق اور اس سے رجوع۔

امام خطابی کہتے ہیں۔ اس پر علماء کا عام اتفاق ہے کہ اگر کوئی عاقل و بالغ صراحت کے ساتھ طلاق دے تو طلاق ہوجائے گی۔ اسے وہ مذاق قرار دے کر کالعدم کرنا چاہے تو اس کی بات نہیں مانی جائے گی۔ بعض علماء نے اس حرکت کو اللہ تعالیٰ کی آیات کے ساتھ مذاق کے ہم معنی کہا ہے۔ اس لیے کہ اسے جائز کر دیا جائے تو اس بات کا خطرہ ہے کہ ایک شخص نکاح کرنے، طلاق دینے اسی طرح غلام کو آزاد کرنے کے بعد یہ کہہ کر اپنے اقدام کو واپس لے سکتا ہے کہ وہ مذاق کر رہا تھا۔ اس سے احکامِ الٰہی پر عمل ہی ختم ہوجائے گا۔ اس لیے حدیث میں جن باتوں کا ذکر ہے ان کے بارے میں زبان سے کسی فیصلہ کے اظہار کے بعد ان پر عمل لازم آجائے گا۔[۲]

---

۱ ابو داؤد، کتاب الطلاق، باب فی الطلاق علی الہزل۔ ترمذی، ابواب الطلاق واللعان، باب ماجاء فی الجد والہزل فی الطلاق۔

۲ معالم السنن: ۳/۲۴۳

طلاق سخت ناپسندیدہ ہے

اسلام نے وقت ضرورت طلاق کی اجازت ضرور دی ہے لیکن اس کے ساتھ یہ بھی بتا دیا ہے کہ یہ کوئی مستحسن فعل نہیں ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ ایک سخت ناپسندیدہ اقدام ہے، اس لیے ناگزیر ضرورت اور انتہائی مجبوری ہی میں یہ اقدام ہونا چاہیے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔

ابغض الحلال الی اللہ عز و جل الطلاق[۱]	اللہ عزوجل کے نزدیک حلال چیزوں میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ چیز طلاق ہے۔

حضرت محارب بن دثارؒ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد نقل کرتے ہیں۔

ما احل اللہ شیئا ابغض الیہ من الطلاق[۲]	اللہ نے کوئی ایسی چیز حلال نہیں کی جو طلاق سے زیادہ اسے ناپسند ہو۔

اسی مفہوم کی ایک روایت حضرت معاذؓ سے مروی ہے۔ گو یہ سنداً کم زور ہے لیکن اوپر کی روایات کی تائید کرتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

یا معاذ ما خلق اللہ شیئا علی وجہ الارض احب الیہ من العتاق ولا خلق اللہ شیئا علی وجہ الارض ابغض الیہ من الطلاق[۳]	اے معاذ! اللہ نے سطح زمین پر کوئی ایسی چیز نہیں پیدا کی جو غلام کو آزاد کرنے سے زیادہ اسے پسند ہو۔ اسی طرح اس نے روئے زمین پر کوئی ایسی چیز نہیں پیدا کی جو طلاق سے زیادہ اسے مبغوض ہو۔

ایک طرف اسلام نے مرد کے ذہن میں یہ بات بٹھائی کہ طلاق ایک ناپسندیدہ عمل ہے دوسری طرف عورت کو ہدایت کی کہ وہ بلا وجہ مرد سے طلاق کا مطالبہ نہ

۱۔ ابوداؤد، کتاب الطلاق، باب فی کراہتہ الطلاق۔ ابن ماجہ، ابواب لطلاق

۲۔ ابوداؤد حوالہ سابق

۳۔ دار قطنی مع التعلیق المغنی، کتاب الطلاق، ص ۴۳۹

کرے۔ حضرت ثوبانؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ایما امرأة سالت زوجھا طلاقا فی غیر ما باس فحرام علیھا رائحة الجنة[1]	جو عورت بغیر کسی مجبوری کے شوہر سے طلاق کا مطالبہ کرے تو اس پر جنت کی خوشبو (بھی) حرام ہے۔

عورت کی کم زوریوں کو برداشت کیا جائے

اجتماعی زندگی کسی فرد واحد کی مرضی کے تابع نہیں ہوتی۔ آدمی کو اجتماعی مفاد کے لیے اپنی رائے اور مرضی کو قربان کرنا پڑتا ہے۔ ازدواجی زندگی میں بھی اس طرح کے مواقع آتے رہتے ہیں جب کہ میاں بیوی کو ایک دوسرے کی رائے اور رجحان سے اختلاف ہوتا ہے۔ اگر ان میں سے کسی کو کوئی بات پسند نہ آئے تو اس کا حل یہ نہیں ہے کہ جھٹ سے طلاق دے کر اس پاکیزہ رشتہ ہی کو ختم کر دیا جائے۔ بعض اوقات آدمی پر جذبات اور خواہشات کا غلبہ ہوتا ہے۔ وہ اپنا صرف فوری فائدہ دیکھتا ہے، بڑے اور اہم مفادات اس کی نگاہ سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ خاندان کے وسیع تر مصالح اور اہم مفادات کے پیش نظر معمولی غلطیوں کو برداشت کیا جائے، اور محبت اور حسن سلوک کا رویہ جاری رکھا جائے۔ فرمایا۔

وَ عَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّ يَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا ○ (النساء:۱۹)	اور ان کے ساتھ بھلے طریقہ سے زندگی بسر کرو۔ اگر تم ان کو ناپسند کرو تو ہوسکتا ہے کہ ایک چیز تم کو ناپسند ہو اور اللہ نے اس میں بہت سی بھلائی رکھ دی ہو۔

---

[1] مشکوٰۃ، کتاب النکاح، باب الخلع والطلاق بحوالہ احمد، ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ، دارمی

اصلاح کی کوشش کی جائے

عورت نا فرمان ہے، سرکشی پر آمادہ ہے، اطاعت نہیں کر رہی ہے تو بھی اسلام فوراً طلاق کا حکم نہیں دیتا بلکہ اس کے لیے اس نے مرد کو خصوصی اختیارات دیے ہیں تاکہ وہ نرمی اور سختی سے اصلاح کی بھرپور کوشش کرے، گھر کے اختلافات گھر ہی کے اندر رہیں اور طلاق کی نوبت نہ آئے۔ فرمایا:

وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ ۚ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيْرًا ۝ (النساء: ۳۴)

جن عورتوں سے تمھیں سرکشی کا اندیشہ ہو تم انھیں سمجھاؤ، خواب گاہوں میں ان سے الگ رہو (اس پر بھی اصلاح نہ ہو تو) مارو۔ اگر وہ تمھاری بات مان لیں تو ان پر زیادتی کے لیے بہانے نہ تلاش کرو۔ بیشک اللہ سب سے اونچا اور بڑا ہے۔

جو عورت سرکشی اور نافرمانی پر آمادہ ہو اس کی اصلاح کا طریقہ اس آیت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ اسے وعظ و نصیحت کی جائے اور سمجھایا بجھایا جائے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ اس کے اندر خدا اور آخرت کا خوف پیدا کرنے کی کوشش کی جائے، ایک دوسرے کے حقوق اور ذمہ داریوں کی طرف توجہ دلائی جائے اور خاندان کے مصالح کا احساس اُبھارا جائے۔ یہ سب کچھ نرمی اور محبت ہی سے ممکن ہے۔ اس میں کامیابی نہ ہو تو قرآن کہتا ہے وَاهْجُرُوْهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ (خواب گاہوں میں ان سے الگ رہو) صحابہ و تابعین نے اس کی تین تشریحیں کی ہیں۔ ایک یہ کہ اپنے ساتھ ہی انھیں بستر پر لٹاؤ، لیکن ان سے جنسی تعلق نہ رکھو۔ دوسرے یہ کہ ان کو ساتھ لٹاؤ، لیکن اپنی ناگواری کے اظہار کے لیے ان سے رُخ پھیر لو اور بات نہ کرو۔ تیسرے کہ یہ ان کا بستر اپنے بستر سے الگ کر لو۔[۱]

۱؎ ابن جریر، جامع البیان فی تفسیر القرآن: ۵/۳۸-۴۱

یہ ایک نفسیاتی تدبیر ہے۔ اس پر مرد اسی وقت عمل کرسکتا ہے جب کہ خود اس کے اندر غیر معمولی ضبطِ نفس ہو۔ اگر وہ اس ضبطِ نفس کا مظاہرہ کرے تو اس کا امکان ہے کہ عورت سرکشی سے باز آجائے۔ جنسی جذبہ بڑا شدید جذبہ ہے۔ جو شخص اس معاملہ میں اپنی قوتِ ارادی کا ثبوت فراہم کرے عورت اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔

بعض طبیعتیں ایسی ہوسکتی ہیں جن کے لیے یہ علاج کارگر نہ ہو، اس صورت میں قرآن نے عورت کو مارنے کی بھی اجازت دی ہے۔ یہ بات بڑی بھیانک معلوم ہوتی ہے لیکن ایک تو یہ کہ اس اجازت پر عمل اس وقت ہوگا جب کہ پہلے دو طریقوں سے عورت اصلاح قبول نہ کرے اور اپنی سرکشی پر قائم رہے۔ اسے پہلے ہی قدم پر نہیں بلکہ آخری چارۂ کار کے طور پر اختیار کیا جائے گا۔ دوسرے یہ کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے وَاضْرِبُوْهُنَّ ضَرْبًا غَيْرَ مُبَرِّحٍ[1] یعنی اصلاح کے لیے انھیں مارنے کی اجازت تو ہے لیکن یہ مار سخت نہیں ہونی چاہیے۔ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ اس کی تشریح میں فرماتے ہیں مسواک یا اس جیسی کسی چیز سے مارا جائے۔ حضرت قتادہؒ کہتے ہیں ایسی مار جس سے جسم میں عیب نہ پیدا ہو۔ حضرت حسن بصریؒ کا ارشاد ہے ایسی مار جس سے بدن پر نشان نہ پڑے[2]

اس سے ہٹ کر وحشیانہ طریقہ سے اگر کوئی شخص عورت کی مار پیٹ شروع کردے تو اسلامی قانون اس کے خلاف حرکت میں آجائے گا۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں شریعت نے جس حد کے اندر عورت کو مارنے کی اجازت دی ہے اس سے بھی اگر عورت انتقال کر جائے تو (اسے قتلِ خطا سمجھا جائے گا) شوہر کے عاقلہ (خاندان والوں) پر دیت واجب ہوجائے گی۔ اور قتلِ خطا کا کفارہ تنہا شوہر کو ادا کرنا ہوگا[3]

---

[1] مسلم، کتاب الحج، باب حجۃ النبیؐ

[2] ابن جریر، جامع البیان فی تفسیر القرآن: ۵/۴۱، ۴۲

[3] نووی، شرح مسلم: ۱/۳۹۷۔ کفارہ سے مراد ہے ایک مسلمان غلام کو آزاد کرنا یا دو مہینے مسلسل روزے رکھنا۔ النساء: ۹۲

طلاق سے روکنے کے لیے عورت اپنے حقوق چھوڑ سکتی ہے

ایک طرف اسلام نے مرد کو اس بات کی بار بار تاکید کی ہے کہ وہ عورت کے ساتھ بہتر سے بہتر سلوک کرے، اس کے حقوق پہچانے، اس کی غلطیوں کو نظر انداز کرے، اس کی خوبیوں کو دیکھے اور اس کی کم زوریوں اور خامیوں کی ہر ممکن طریقے سے اصلاح کرے، دوسری طرف عورت سے کہا کہ معمولی معمولی بات پر طلاق کا مطالبہ لے کر نہ بیٹھ جائے، اگر وہ دیکھے کہ شوہر اس سے بے رُخی برت رہا ہے تو اپنے حقوق کے مطالبہ اور اس پر اصرار کی جگہ اپنے حقوق چھوڑنے کے لیے بھی تیار رہے۔ شوہر سے صف آرائی کی جگہ صلح صفائی کی امکانی کوشش کرے۔ عورت کی طرف سے کسی پیشکش کو قبول کرنے میں مرد کا بے جا پندار حائل ہوسکتا تھا اس لیے اگر عورت اپنے کچھ حقوق سے دست بردار ہوکر مرد کی ذمہ داریوں کو کم کردے تو اس میں مرد کو سبکی یا توہین نہیں محسوس کرنی چاہیے۔ عورت اس کی مدد کرے اور وہ اس سے فائدہ اُٹھائے تو یہ اس کے شان کے منافی نہیں ہے۔ فرمایا۔

وَاِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ مِنْۢ بَعْلِهَا نُشُوْزًا اَوْ اِعْرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا اَنْ يُّصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا ۭ وَالصُّلْحُ خَيْرٌ ۭ وَاُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ ۭ وَ اِنْ تُحْسِنُوْا وَ تَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ○ (النساء:۱۲۸)	اگر کسی عورت کو اپنے شوہر سے بدسلوکی اور بے رُخی کا اندیشہ ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں کہ دونوں آپس میں کسی طرح صلح کرلیں۔ صلح بہرحال بہتر ہے۔ نفس تنگ دلی کی طرف جلد مائل ہوجاتے ہیں۔ اگر تم لوگ احسان سے پیش آؤ اور تقویٰ اختیار کرو تو اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کرتے ہو اس سے باخبر ہے۔

حافظ ابنِ کثیر فرماتے ہیں کہ اگر عورت اس بات کا خطرہ محسوس کرے کہ مرد کے اندر اس سے نفرت اور دوری پیدا ہو رہی ہے تو اسے نان و نفقہ، لباس اور شب باشی

کے جو حقوق حاصل ہیں وہ پورے کے پورے بھی چھوڑ سکتی ہے اور ان میں کمی بھی کرسکتی ہے۔ اس میں کوئی حرج نہیں کہ مرد اسے مان کر صلح کرلے، وہ شوہر پر خرچ کرسکتی ہے اور وہ اس کے تعاون کو قبول کرسکتا ہے۔ قرآن نے کہا ہے وَالصُّلْحُ خَيْرٌ یعنی دونوں کے درمیان تفریق ہونے سے صلح کا ہو جانا بہتر ہے[1]

دونوں طرف کے ذمہ دار اصلاح کی کوشش کریں

بعض اوقات چھوٹی چھوٹی باتوں پر اختلافات شروع ہوتے ہیں اور بڑھتے بڑھتے ان میں شدت آجاتی ہے پھر میاں بیوی کے درمیان ایک طرح کی دوری اور حجاب پیدا ہوجاتا ہے اور وہ اس قابل نہیں رہتے کہ جھگڑوں کو فراموش کرکے خود سے صلح صفائی کرلیں۔ قرآن نے ہدایت کی کہ جہاں دونوں آپس میں اختلافات حل نہ کرسکیں وہاں دونوں طرف کے ایک ایک ذمہ دار سر جوڑ کر بیٹھیں اور ان اختلافات کو حل کرنے کی کوشش کریں۔ اگر خلوص ہو تو اللہ کی مدد حاصل ہوگی اور جو مسائل ناقابل حل سمجھے جاتے ہیں ان کے بھی حل کی کوئی صورت نکل آئے گی۔

وَ اِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَ حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا ۚ اِنْ يُّرِيْدَآ اِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا ۗ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا خَبِيْرًا ○ (النساء: ۳۵)

اگر تمھیں میاں بیوی کے درمیان جھگڑے کا ڈر ہو تو ایک حکم مرد والوں کی طرف سے اور ایک عورت والوں کی طرف سے مقرر کرو۔ وہ دونوں اصلاح کرنا چاہیں تو اللہ ان کے درمیان موافقت کرادے گا۔ بیشک اللہ جاننے والا اور خبر رکھنے والا ہے۔

طلاق کے سلسلہ میں دو اصلاحی اقدامات

ان ساری کوششوں میں ناکامی کے بعد طلاق کا موقع آتا ہے۔ اس میں اسلام نے حسب ذیل اصلاحی اقدامات کیے ہیں۔

---

[1] تفسیر ابن کثیر: ۱/۵۶۲-۵۶۱

۱- عرب میں طلاق اور اس سے رُجوع کی کوئی حد نہیں تھی۔ جو شخص اپنی بیوی کو تنگ کرنا چاہتا وہ اسے طلاق دیتا پھر مدت ختم ہونے سے پہلے رجوع کر لیتا۔ پھر طلاق دیتا پھر رُجوع کر لیتا جب تک وہ چاہتا یہ سلسلہ جاری رہتا۔[۱]

اس طرح عورت شوہر والی ہونے کے باوجود مطلقہ کی زندگی گزارنے پر مجبور ہوتی۔ قرآن نے کہا طلاق دو بار دی جا سکتی ہے۔ اسی میں آدمی کو رُجوع کا حق ہوگا۔

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَاِمْسَاکٌ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِیْحٌ بِاِحْسَانٍ (البقرۃ:۲۲۹)	طلاق (رجعی) دو بار ہے۔ پھر یا تو عورت کو معروف طریقہ سے رکھ لیا جائے یا بھلے طریقہ سے رخصت کر دیا جائے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ تیسری بار طلاق دی گئی تو رجوع کا حق ختم ہو جائے گا اور بیوی جدا ہو جائے گی۔

۲- آدمی تین طلاقوں کے اس حق کو بھی لمبے لمبے وقفہ کے لیے استعمال کر کے عورت کو پریشان کر سکتا تھا۔ جیسے ایک طلاق دے اور سال دو سال تک رجوع نہ کرے پھر جی چاہے تو رجوع کر لے۔ اسی طرح دو بارہ طلاق دے کر ایک طویل عرصہ تک اسے لٹکائے رکھے۔ نہ اس کے حقوق ادا کرے اور نہ اسے جدا کرے۔ جب اس سے بھی اکتا جائے تو تیسری طلاق دے کر الگ کر دے۔

اسلام نے اس زیادتی سے روکنے کے لیے ایک مختصر سی مدت مقرر کر دی۔ اسی مدت کے اندر مرد کو طلاق سے رجوع یا عدم رجوع کا فیصلہ کرنا ہوگا۔ اسی کو اصطلاح میں 'عدت' کہا جاتا ہے۔ عدت گزرنے کے بعد بیوی خود بہ خود آزاد ہو جائے گی اور اپنی مرضی سے جہاں چاہے دوسری شادی کر سکے گی۔[۲]

۱- اس کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔ تفسیر ابن کثیر: ۱/۲۷۱-۲۷۲

۲- اگر مرد تین طلاق ایک ساتھ دے دے تو بیشتر فقہاء کے نزدیک رجوع کا حق ہی ختم ہو جائے گا اور عدت پوری ہونے کے بعد عورت کو دوسری شادی کرنے کا حق حاصل ہو جائے گا۔ تفصیل آگے آ رہی ہے۔

قرآن مجید نے ہدایت کی کہ طلاق دی جائے تو اس کا باقاعدہ حساب رکھا جائے۔ یہ کوئی کھیل نہیں ہے کہ آدمی جب چاہے طلاق دے بیٹھے اور اسے یہ بھی نہ معلوم ہو کہ کب طلاق دی اور کب اس کی مدت ختم ہوتی ہے۔

یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ وَ اَحْصُوا الْعِدَّةَ (البقرۃ:۲۲۹)	اے نبی جب تم لوگ عورتوں کو طلاق دو تو ان کو عدت پر طلاق دو اور عدت کا حساب رکھو۔

طلاق کی نوبت خلوت صحیحہ کے بعد بھی آسکتی ہے اور خلوت صحیحہ سے پہلے بھی۔ خلوتِ صحیحہ کے بعد طلاق دی جائے تو اس کی عدت تین حیض ہے۔ ارشاد ہے۔

وَالْمُطَلَّقٰتُ یَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ (البقرۃ:۲۲۸)	جن عورتوں کو طلاق دی گئی ہے وہ تین حیض تک اپنے آپ کو انتظار میں رکھیں۔

یہ جوان عورت کا ذکر ہے جسے حیض آتا ہو۔ جن عورتوں کو کم سنی، کبر سنی یا اور کسی وجہ سے حیض نہ آئے ان کی عدت تین مہینے ہے۔ اگر عورت حاملہ ہے تو وضع حمل اس کی عدت ہوگی۔

وَالّٰٓئِیْ یَئِسْنَ مِنَ الْمَحِیْضِ مِنْ نِّسَآئِکُمْ اِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلٰثَةُ اَشْهُرٍ وَّالّٰٓئِیْ لَمْ یَحِضْنَ ؕ وَ اُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ یَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ؕ (الطلاق:۴)	اور تمھاری جو عورتیں حیض سے مایوس ہو چکی ہوں۔ اگر تمھیں ان کے بارے میں شبہ ہو تو (تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ) ان کی عدت تین ماہ ہے۔ یہی حکم ان عورتوں کا ہے جنھیں ابھی تک حیض نہیں آیا ہے۔ اور جن عورتوں کے حمل ہو ان کی عدت یہ ہے کہ ان کا وضعِ حمل ہو جائے۔

اگر خلوتِ صحیحہ سے پہلے طلاق ہوئی ہے تو اس کی کوئی عدت نہیں ہے۔ ارشاد ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّوْنَهَا ۚ فَمَتِّعُوْهُنَّ وَ سَرِّحُوْهُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا۝ (الاحزاب:۴۹)	اے ایمان والو! جب تم ایمان والی عورتوں سے نکاح کرو اور ہاتھ لگانے سے پہلے انھیں طلاق دے دو تو تمھیں انھیں عدت میں بٹھانے کا حق نہیں ہے کہ اس کی گنتی پوری کراؤ۔ انھیں متاع دو اور اچھی طرح رخصت کر دو۔

طلاق کس طرح دی جائے؟

اسلام نے طلاق کی اِجازت تو ضرور دی ہے، لیکن وہ چاہتا ہے کہ آدمی بے سوچے سمجھے محض جذبات کی رو میں طلاق نہ دے بیٹھے، بلکہ طلاق کا فیصلہ ہو تو انتہائی سنجیدگی سے اور غور وفکر کے بعد ہو۔ طلاق اسی وقت دی جائے جب کہ عملاً میاں بیوی میں نباہ مشکل ہو جائے اور علیٰحدگی کے سوا کوئی چارۂ کار نہ رہ جائے۔ اس معاملے میں بے احتیاطی سے بچنے کے لیے وہ طریقہ اپنانا ہوگا جس کی تعلیم حدیث میں دی گئی ہے۔

طلاق حالتِ حیض میں نہیں، حالتِ طہر میں دی جائے

حدیث میں طلاق کے سلسلے میں دو خاص ہدایات دی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ حالتِ حیض میں طلاق نہ دی جائے۔ دوسری یہ کہ آدمی طلاق دے تو حالتِ طہر میں بغیر ہم بستری کے طلاق دے۔ ان دونوں ہدایات کی معنویت واضح ہے۔

حیض کے دوران میں، عورت کے اندر وہ نشاط اور تازگی نہیں ہوتی جو عام حالت میں ہوتی ہے اور کبھی کبھی اس کے مزاج میں ایک طرح کا چڑچڑا پن پیدا ہو جاتا ہے۔ اس میں اس کا امکان ہے کہ عورت کی کوئی بات مرد کو ناگوار گزرے اور وہ طلاق دے بیٹھے۔ اس مدت میں بیوی سے تعلق نہیں رکھا جاسکتا، اس لیے عورت کی کم زوریوں کو برداشت کرنے کی جگہ کوئی سخت قدم اٹھانا بعید از قیاس نہیں ہے۔

حالتِ طہر میں مجامعت کے بغیر طلاق دینے کی بھی بہت سی حکمتیں ہیں۔ ایک حکمت تو یہ ہے کہ طہر اس بات کی علامت ہے کہ عورت حاملہ نہیں ہے۔ ہم بستری سے حمل کا امکان پیدا ہو جاتا ہے۔ شریعت یہ چاہتی ہے کہ عورت کا حاملہ یا غیر حاملہ ہونا واضح رہے، اس لیے کہ اس سے بہت سے مسائل وابستہ ہیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ مرد طلاق دینا چاہے تو طہر میں ہم بستری سے اجتناب کرے۔ ایک بڑی حکمت اس طریقہ میں یہ پوشیدہ ہے کہ حالتِ طہر میں میاں بیوی کا رجحان جنسی تسکین کی طرف ہوتا ہے، اس وجہ سے وہ بہت سے اختلافات کو بھول جاتے ہیں یا برداشت کرنے لگتے ہیں۔ جس طہر میں ایک مرتبہ جنسی تسکین کا موقع مل جائے اس رجحان میں کچھ نہ کچھ کمی آسکتی ہے۔ اس لیے ہدایت کی گئی ہے کہ حالتِ طہر میں جنسی تعلق سے کنارہ کش رہ کر طلاق دی جائے۔ یہ نفسیاتی طور پر ایک مشکل کام ہے۔ یہ مشکل اور بڑھ جاتی ہے جب کہ تینوں طلاقیں اسی طرح حالت طہر میں جنسی تعلق قائم کیے بغیر دی جائیں۔ اس پر آدمی اسی وقت عمل کرسکتا ہے جب کہ اس نے طلاق کا پوری سنجیدگی سے فیصلہ کرلیا ہو۔

طلاقِ مسنون وغیر مسنون

طلاق کا طریقہ قرآن وحدیث میں بتا دیا گیا ہے۔ اس کے خلاف جو بھی طریقہ اختیار کیا جائے وہ غیر شرعی اور ناروا ہوگا۔ فقہ حنفی میں اس موضوع پر نسبتاً زیادہ تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔ اس کے مطابق طلاق کی دو قسمیں ہیں۔ ایک طلاق سنّی یا مسنون طلاق اور دوسری طلاق بدعی یا غیر مسنون طلاق۔

طلاقِ مسنون کے معنی

طلاق سنّی کے معنی یہ نہیں ہیں کہ طلاق کوئی عبادت یا کار ثواب ہے، اس لیے کہ یہ ایک عمل مباح ہے۔ یعنی اس کا صرف جواز ہے۔ طلاق سنی یا مسنون طلاق وہ ہے جس میں آدمی اس طریقہ کی پابندی کرے جو سنت سے ثابت ہے۔ اس کی وجہ

سے وہ معصیت اور گناہ سے بچ جائے گا۔ ہاں اگر طلاق بدعی کا کوئی محرک یا داعیہ موجود ہو اور پھر بھی وہ سنت کی اتباع کرے یا اس کے اندر سنت پر عمل کا جذبہ کارفرما ہو تو اس پر وہ اجر کا مستحق ہوسکتا ہے[1]

احسن یا افضل طریقہ

مسنون طلاق کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک احسن (زیادہ اچھا یا زیادہ پسندیدہ) دوسری حسن (اچھا یا پسندیدہ)۔

طلاق کا احسن طریقہ یہ ہے کہ حالتِ طہر میں ہم بستری کے بغیر صرف ایک طلاق دی جائے۔ عورت جب ماہ واری سے فارغ ہو تو حالتِ طہر شروع ہوجاتی ہے۔ ایک بار طلاق دینے کے بعد عدت (تین حیض) پوری ہونے تک دوسری طلاق نہ دی جائے۔ جب عدت پوری ہو جائے گی تو یہ طلاق بائنہ ہوگی اور ازدواجی رشتہ منقطع ہو جائے گا۔ اس کا فائدہ یہ ہے کہ عدت کے دوران میں آدمی چاہے تو رجوع کرسکتا ہے اگر رجوع نہ کرے اور عدت پوری ہو جائے تو بغیر حلالہ کے دوبارہ نکاح ہوسکتا ہے۔ یہ عورت کے حق میں بھی مفید ہے۔ دونوں حلالہ کی زحمت اور پریشانی سے بچ سکتے ہیں۔

طہر کی حالت میں ہم بستری کے بغیر کسی بھی وقت طلاق دی جاسکتی ہے۔ اگر شروع ہی میں طلاق دے کر علیحدگی اختیار کرلی جائے تو درمیان میں ہم بستری کا امکان کم رہے گا۔

اس کے احسن ہونے کا ثبوت صحابۂ کرامؓ کے اسوہ سے ملتا ہے۔ ان کے بارے میں آتا ہے کہ وہ ایک ہی طلاق دیا کرتے تھے۔ مصنف ابن ابی شیبہ میں حضرت ابراہیم نخعی کا بیان ہے کہ۔

---

[1] ابن الہمام، فتح القدیر: ۳/۴۴۷، دار الکتب العلمیہ، لبنان ۱۹۹۵ء۔ ابن عابدین، رد المحتار علی الدر المختار: ۴/۴۳۲- دارالکتب العلمیہ، لبنان ۱۹۹۴ء

كانــوا يستحبون ان يطلقهــا واحدة ثم يتركها حتى تحيض ثلاث حيض[1]	وہ یہ پسند کرتے تھے کہ کوئی شخص عورت کو (طلاق دے تو) ایک مرتبہ طلاق دے پھر اسے چھوڑ دے (ازدواجی تعلق نہ رکھے) یہاں تک کہ اسے تین حیض آ جائیں (اور عدت پوری ہو جائے)

اس طریقۂ طلاق کے احسن ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس کے جواز میں فقہاء کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اس میں کراہت کا بھی کوئی پہلو نہیں ہے۔

حسن یا بہتر طریقہ

طلاق حسن یہ ہے کہ بیوی سے ہم بستری کے بغیر تین طہروں میں تین طلاقیں دی جائیں۔ صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ طلاق حالتِ طہر میں دی جانی چاہیے۔ صحاح کی سب ہی کتابوں میں یہ واقعہ موجود ہے کہ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ نے اپنی بیوی کو حالتِ حیض میں طلاق دے دی۔ حضرت عمرؓ نے رسول اللہ ﷺ سے اس کے متعلق دریافت کیا تو آپؐ نے فرمایا۔

مره فليراجعها ثم ليمسكها حتى تطهر، ثم تحيض ثم تطهر ثم ان شاء امسك بعد و ان شاء طلق قبل ان يمس	عبد اللہ سے کہو کہ وہ اس سے رجوع کرے اور بیوی کے ساتھ رہے یہاں تک کہ وہ حیض سے پاک ہو جائے۔ پھر اس کے بعد دوبارہ جب حیض آئے اور اس سے بھی پاک ہوجائے تو چاہے اسے رکھے یا طلاق دے تو مجامعت اور ہم بستری سے پہلے دے۔

آپ نے یہ بھی فرمایا کہ قرآن مجید کے الفاظ **فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ** (الطلاق:۱) (انھیں ان کی عدت میں طلاق دو) سے یہی مراد ہے[2]۔

دارِ قطنی کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عبد اللہ ابن عمرؓ سے

---

[1] زیلعی، نصب الرایۃ فی تخریج احادیث الھدایہ مع الھدایہ: ۲۹۲/۳۔ دار الکتب العلمیہ، لبنان ۱۹۹۶ء

[2] بخاری، کتاب الطلاق، باب قولہ تعالیٰ یٰٓاَیُّھَا النَّبِیُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ۔ نیز ملاحظہ ہو کتاب التفسیر، اور کتاب الاحکام۔ مسلم، کتاب الطلاق میں اس کے متعدد طرق کی تفصیل ہے۔ ابوداؤد، کتاب الطلاق۔

فرمایا' سنت یہ ہے کہ عورت حیض سے فارغ ہو جائے اور طہر کی حالت شروع ہو جائے تو طلاق دو، پھر ہر حیض کے بعد حالت طہر میں طلاق دو۔[1]

بعض اوقات طہر کی مدت طویل ہو جاتی ہے۔ جوان عورت کو حیض آنے کے بعد لمبے عرصہ تک دوبارہ حیض نہیں آتا۔ رضاعت کے زمانہ میں بھی عام طور پر طہر کی مدت طویل ہو جاتی ہے۔ سنت کے مطابق طلاق کا طریقہ یہی ہوگا کہ اس طرح کے لمبے طہر میں بھی ہم بستری ہوئی ہے تو حیض کے آنے کا انتظار کیا جائے۔ اس کے بعد حالتِ طہر میں مجامعت کے بغیر طلاق دی جائے۔[2]

امام مالک فرماتے ہیں کہ طلاق اصلاً ممنوع ہے۔ ضرورت کے تحت اسے حلال کیا گیا ہے، لہٰذا ایک سے زیادہ طلاق دینا ہی بدعت ہے۔ اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ طلاق ایک ضرورت ہی کے تحت جائز قرار دی گئی ہے۔ جب کوئی شخص حالت طہر میں جنسی رغبت کے باوجود طلاق دے رہا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اس کی ضرورت محسوس کر رہا ہے۔ اس ضرورت کے تحت پھر حالت طہر میں وہ دوسری اور تیسری بار طلاق دے رہا ہے۔[3]

جس عورت کو کم عمری یا زیادہ عمر کی وجہ سے حیض نہیں آرہا ہے اسے ہم بستری کے فوراً بعد بھی طلاق دی جاسکتی ہے۔ اس کے حق میں طریقہ سنت یہ ہے کہ ایک مہینہ میں ایک طلاق دی جائے۔ اس طرح تین طلاقیں پوری ہوں گی۔ لیکن احناف میں امام

---

[1] حضرت عبد اللہ بن عمرؓ سے اس واقعہ کے سلسلے میں مروی طویل روایت کا یہ ایک حصہ ہے۔ اس میں یہ بھی مذکور ہے کہ بیک وقت تین طلاق دینا معصیت ہے لیکن وہ نافذ ہو جائے گی۔ اس روایت کو بعض محدثین نے قبول نہیں کیا ہے، کیوں کہ اس کے ایک راوی عطاء خراسانی پر جرح کی گئی ہے، لیکن اس کی متابعت طبرانی کی روایت سے ہوتی ہے جو دوسری سند سے مروی ہے۔ اس لیے احناف نے اسے قابل قبول قرار دیا ہے۔ ملاحظہ، نصب الرایہ: ۳/۲۹۲-۲۹۳۔ ابن الہمام، فتح القدیر، ۳/۴۴۸-۴۴۹

[2] ابن عابدین، رد المحتار علی الدر المختار: ۴/۴۲۳

[3] ہدایہ مع فتح القدیر: ۳/۴۴۹

زُفر کی رائے یہ ہے کہ اسے بھی ہم بستری کے بعد جب ایک ماہ گزر جائے تو طلاق دی جائے گی۔

جس عورت سے خلوت نہیں ہوئی ہے سنت کا تقاضا یہ نہیں ہے کہ اسے بھی حالتِ طہر ہی میں طلاق دی جائے، اسے حالتِ حیض میں بھی طلاق دی جاسکتی ہے۔ امام زفر کا اس میں بھی اختلاف ہے۔ ان کے نزدیک اسے بھی حالتِ طہر ہی میں طلاق دی جانی چاہیے۔[1]

دورانِ حیض طلاق کا حکم

حضرت عبد اللہ بن عمرؓ نے اپنی بیوی کو حیض کی حالت میں طلاق دی تو رسول اللہ ﷺ نے رجوع کا حکم دیا اور فرمایا کہ اگر طلاق دینی ہو تو طہر کی حالت میں طلاق دو۔ سوال یہ ہے کہ حالت حیض میں دی گئی طلاق سے رجوع کے حکم کی نوعیت کیا ہے؟ حافظ ابن حجر کہتے ہیں کہ جمہور علماء کا خیال ہے کہ اس طرح کی طلاق سے رجوع کرنا مستحب اور پسندیدہ ہے۔ امام مالک کے نزدیک رجوع واجب ہے۔ امام احمد سے بھی ایک روایت وجوب ہی کی ملتی ہے۔ ایک دوسری روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسے مستحب سمجھتے ہیں۔[2]

احناف میں سے بعض حضرات نے اسے مستحب کہا ہے، لیکن محققین احناف نے اسے واجب قرار دیا ہے۔[3]

حیض کی حالت میں طلاق دی جائے تو اس کے فوراً بعد حالتِ طہر میں طلاق دینا بعض فقہا کے نزدیک جائز ہے۔ اس میں وہ کوئی حرج نہیں محسوس کرتے۔ حضرت

---

[1] یہ تفصیلات ہدایہ مع فتح القدیر، جلد۳، کتاب الطلاق اور رد المحتار علی الدر المختار: جلد۴ کتاب الطلاق سے لی گئی ہیں۔

[2] ابن حجر، فتح الباری: ۴۳۹/۱۰

[3] ہدایہ مع فتح القدیر: ۴۶۲/۳

عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت کی جو تفصیلات ملتی ہیں ان میں سے بعض میں اس کا اشارہ موجود ہے۔ لیکن اس سلسلے کی جو روایت گزر چکی ہے اس میں صاف صاف کہا گیا ہے کہ حیض کی حالت میں حضرت عبد اللہ بن عمرؓ نے جو طلاق دی ہے اس سے وہ رجوع کریں اور بیوی کو ساتھ رکھیں۔ پھر جب دوبارہ اسے حیض آئے اور اس سے بھی وہ پاک ہو جائے تو بغیر ہم بستری کے اگر وہ چاہیں تو طلاق دیں۔ یہ تفصیل بعض ثقہ راویوں کی ہے اس لیے اسے قبول کرنا ہوگا۔

فقہائے احناف میں امام یوسف اور امام محمد کی یہی رائے ہے۔ بعض محققین کے نزدیک امام ابو حنیفہ کی بھی رائے یہی ہے۔ امام شافعی سے مشہور روایت یہی نقل ہوئی ہے۔ امام مالک اور امام احمد کی بھی یہی رائے ہے[1]

اس کی بہت سی حکمتیں ہوسکتی ہیں کہ آدمی محض حالتِ طہر میں طلاق دینے کی خاطر حیض میں دی گئی طلاق سے رجوع نہ کرے بلکہ کچھ وقت اس کے ساتھ گزارے۔ طلاق سے پہلے پوری مدتِ طہر پھر پوری مدتِ حیض جب گزر جائے تو طلاق دینے کا فیصلہ کرے۔ اس مدت میں ہوسکتا ہے کہ میاں بیوی کے درمیان ازدواجی تعلقات قائم ہو جائیں اور طلاق کا ارادہ بدل جائے۔ اس کی کچھ اور حکمتیں بھی ہوسکتی ہیں[2]

جمہور علماء کے نزدیک حیض کی حالت میں جو طلاق دی جائے وہ واقع ہو جاتی ہے۔ لیکن علامہ ابن حزم فرماتے ہیں کہ وہ واقع نہیں ہوگی۔ متاخرین میں امام ابن تیمیہ کی بھی یہی رائے ہے۔ جمہور کی دلیل یہ ہے کہ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ نے جو طلاق دی تھی وہ شمار کی گئی تھی[3]

---

[1] ابن ہمام، فتح القدیر: ۳/۴۶۳-۴۶۴

[2] تفصیل کے لیے دیکھیے فتح الباری: ۱۰/۴۴۰

[3] بخاری: کتاب الطلاق، باب اذا طلقت الحائض تعتد بذلك الطلاق۔ اس سلسلہ کی روایات کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، مسلم، کتاب الطلاق، باب تحریم طلاق الحائض بغیر رضاها و انه لو خالف وقع الطلاق و یؤمر برجعتها۔

طلاق بدعی

مسنون طلاق کے تفصیل سے ذکر کے بعد غیر مسنون یا بدعی طلاق کی حسبِ ذیل صورتیں واضح طور پر سامنے آتی ہیں۔

۱- ایک ساتھ تین طلاق دینا۔

۲- طہر کی حالت میں جس میں ہم بستری ہوئی ہو طلاق دینا۔

۳- ایک طہر میں تین طلاق دینا۔

۴- حیض کی حالت میں طلاق دینا۔

۵- حیض کی حالت میں مجامعت کر کے طلاق دینا[1]

عدت کے دوران میں عورت شوہر کے گھر رہے گی

طلاق کے بعد جب تک عدت پوری نہ ہو جائے، حکم ہے کہ عورت شوہر کے گھر رہے گی اِلاّ یہ کہ اس سے کوئی بے حیائی کا فعل سرزد ہو اور ساتھ رہنا مشکل ہو جائے۔ فرمایا:

لاَ تُخْرِجُوْهُنَّ مِنْۢ بُيُوْتِهِنَّ وَلاَ يَخْـرُجْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ (الطلاق:۱)	زمانہ عدت میں ان عورتوں کو ان کے گھروں سے نہ نکالو اور نہ وہ خود نکلیں الاّ یہ کہ وہ کسی صریح بے حیائی کا ارتکاب کریں۔

اس کی ایک مصلحت یہ ہے کہ ایک گھر میں ساتھ رہنے کی وجہ سے مرد کو اپنے فیصلہ پر اور عورت کو اپنے رویہ پر غور و فکر کرنے اور سوچنے کا موقع ملے گا۔ اس طرح تعلقات کی بحالی کی کوئی صورت نکل سکے گی۔

ان تینوں باتوں پر عمل ایک ساتھ ہو تو طلاق میں جلد بازی اور بے احتیاطی

---

[1] طلاق سنت اور طلاق بدعت کی تفصیل کے لیے دیکھی جائے۔ ہدایہ مع فتح القدیر: ۴۳۱/۳ اور آگے ابن عابدین، رد المختار علی الدر المختار: ۲۲۷/۴ اور آگے۔

کے امکانات یقیناً کم سے کم تر ہوجائیں۔ اگر ایک سے دوبار طلاق کی نوبت آ بھی جائے تو آدمی کو اپنے فیصلہ پر نظر ثانی کرنے اور رجوع کرنے کا موقع باقی رہے گا۔

رجوع کا حق اور اس کا طریقہ

ایک یا دو طلاق دینے پر عدت ختم ہونے سے پہلے رجوع کا حق ہے۔ اگر صریح الفاظ میں رجوع ہو تو اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ رجوع ہو جائے گا۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں رجوع لازماً زبان سے ہونا چاہیے۔ احناف کے نزدیک ہم بستری، بوس و کنار وغیرہ بھی رجوع کے ہم معنی ہے۔ امام شافعی نے رجوع پر گواہوں کی موجودگی کو ضروری قرار دیا ہے، لیکن احناف اسے صرف مستحب اور پسندیدہ کہتے ہیں۔ امام مالک کی بھی یہی رائے ہے[1]

کسی نے ایک یا دو طلاق دی اور عدت ختم ہونے سے پہلے رجوع نہیں کیا تو بیوی جدا ہو جائے گی۔ وہ اگر دوبارہ اس سے ازدواجی تعلق قائم کرنا چاہے اور بیوی بھی اس کے لیے آمادہ ہو تو نئے مہر کے ساتھ دوبارہ نکاح ہوسکتا ہے۔ بیوی انکار کردے تو وہ زبردستی نہیں کرسکتا۔

اگر کوئی شخص تیسری مرتبہ طلاق دے دے تو بیوی سے اس کا تعلق ختم ہوجائے گا۔ اب اس سے نکاح کی صورت صرف یہ ہے کہ کسی دوسرے شخص سے اس عورت کے نکاح کے بعد پھر طلاق ہو جائے یا وہ انتقال کر جائے اور دونوں دوبارہ نکاح کے لیے تیار ہو جائیں۔

فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ۗ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ

اگر مرد عورت کو (تیسری بار) طلاق دے دے تو وہ اس کے لیے حلال نہ ہوگی جب تک کہ وہ کسی دوسرے شخص سے نکاح نہ کرلے۔ اگر دوسرا شوہر اسے طلاق دے دے

---

[1] ہدایہ: ۳۷۵/۲۔ بدایۃ المجتہد: ۹۲/۲

يَتَرَاجَعَآ اِنْ ظَنَّآ اَنْ يُّقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ○ (البقرہ:۲۳۰)

اور پہلا شوہر اور وہ دونوں سمجھیں کہ وہ اللہ کے حدود کو قائم رکھ سکیں گے تو ان کے لیے ایک دوسرے کی طرف رجوع کرنے میں کوئی گناہ نہیں ہے۔ یہ اللہ کے قائم کردہ حدود ہیں انھیں وہ جاننے والوں کے لیے بیان کرتا ہے۔

اس طرح تین طلاق کے بعد رجوع بہت مشکل ہے، انسان کی طبیعت بھی شاید بہ خوشی اس کے لیے تیار نہیں ہوتی۔ یہ صورت اس لیے رکھی گئی ہے کہ تین طلاق دینے سے پہلے آدمی اچھی طرح سوچ لے کہ اب رجوع آسان نہیں ہے۔ عورت ہمیشہ کے لیے جدا ہوسکتی ہے۔

ایک مجلس کی تین طلاقوں کا حکم

اس بحث کو ختم کرنے سے پہلے ایک سوال سے جو عام طور پر کیا جاتا ہے، تعرض کرنا ضروری ہے۔ وہ یہ کہ اگر کوئی شخص طلاق کا افضل طریقہ نہ اختیار کرے یعنی صرف ایک طلاق پر اکتفا نہ کرے یا طلاق حسن پر عمل نہ کرے اور تین طہر میں یا ایک ایک ماہ کے وقفے سے طلاق نہ دے بلکہ ایک ہی مجلس میں تین طلاقیں دے ڈالے تو کیا اسے رجوع کا حق حاصل ہوگا یا یہ طلاقیں بائنہ مغلظہ سمجھی جائیں گی اور اسے رجوع کا حق نہ ہوگا؟

عام فقہاء کے نزدیک یہ طلاقیں بائنہ ہوں گی اور رجوع کا حق باقی نہیں رہے گا، لیکن علماء اہل حدیث ایک مجلس کی تین طلاقوں کو ایک طلاق رجعی مانتے ہیں اور عدت پوری ہونے سے پہلے رجوع کا حق تسلیم کرتے ہیں۔ یہ ایک قانونی بحث ہے۔ اتنی بات سب کے نزدیک طے ہے کہ ایک مجلس یا ایک طہر میں تین طلاق دینا غیر مسنون، ناپسندیدہ اور غلط عمل ہے۔ فقہ حنفی میں جیسا کہ عرض کیا گیا اسے طلاق بدعت کہا گیا ہے۔ اس کے ارتکاب سے آدمی گناہ گار ہوتا ہے۔

ایک ہی مجلس میں تین طلاقیں بالعموم وقتی غم و غصہ یا کسی ناگواری کی وجہ سے دی جاتی ہیں۔ اس کے پیچھے کوئی سوچا سمجھا فیصلہ نہیں ہوتا۔ اس غلط اور ہنگامی اقدام کے سنگین نتائج سامنے آتے ہیں اور آدمی اچانک اپنا گھر اجڑتا ہوا دیکھتا ہے تو افسوس کرنے لگتا ہے۔ سنت نے طلاق کا جو طریقہ بتایا ہے اس پر عمل ہو تو محض عجلت اور جلد بازی سے جو پیچیدگیاں ہو جاتی ہیں وہ پیدا نہیں ہوں گی۔ طلاق بعض اوقات ناگزیر ہو جاتی ہے۔ قرآن و حدیث نے اس کا بہترین طریقہ بتایا ہے۔ اسے عام کرنے اور رواج ترتیب دینے کی ضرورت ہے۔ اس سے وہ تمام اعتراضات از خود رفع ہو جائیں گے جو اس موضوع پر کیے جاتے ہیں۔

مطلقہ کا نفقہ

اسلام کے قانونِ طلاق پر جو اعتراضات کیے جاتے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ مرد طلاق کے دو بول بول کر عورت کو بیک بینی و دو گوش گھر سے نکال باہر کر دیتا ہے اور وہ سوسائٹی میں بے یار و مددگار در بدر ٹھوکریں کھانے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ یہ اعتراض بہت پرانا اور بڑا بے جان ہے۔ لیکن اسے بار بار اس طرح دہرایا جاتا ہے جیسے اسلامی شریعت کے لیے یہ ایک زبردست چیلنج ہے اور اس کا اس کے پاس کوئی معقول جواب نہیں ہے۔ اس اعتراض کا کھوکھلا پن ہر پہلو سے واضح کیا جاتا رہا ہے لیکن جن لوگوں کا مقصد محض اعتراض ہو وہ اپنی کم زوری کبھی تسلیم نہیں کر سکتے اور انھیں کوئی جواب مطمئن نہیں کر سکتا۔ وہ تو صرف یہ چاہتے ہیں کہ ان کے اعتراض کو معقول مان کر ان کے حسب منشا قانونِ شریعت کی 'خامیوں' کو دور کر دیا جائے اور اس کی مناسب 'اصلاح' کر دی جائے۔ ان کے نزدیک جو شخص عورت کو طلاق دے اسے یہ سزا ضرور ملنی چاہیے کہ وہ اس کی زندگی بھر اس کا نان و نفقہ برابر دیتا رہے۔ ہاں اگر اس کی دوسری شادی ہو جائے یا وہ خود کفیل ہو جائے تو مرد کو اس کی معاشی ذمہ داریوں سے سبک دوش کر دیا جائے۔ سپریم کورٹ کے حالیہ فیصلہ نے اسلام کے نظام طلاق پر ہونے والے اس اعتراض کو ایک طرح سے صحیح قرار دے دیا ہے اور اس تجویز کو قانونی سند عطا کر دی ہے

کہ طلاق کے بعد بھی عورت کا نفقہ اس کی زندگی بھریا تا نکاحِ ثانی جاری رہنا چاہیے۔ اس لیے ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ اس مسئلہ کا ذرا تفصیل سے جائزہ لیا جائے۔[۱]

بعض قباحتیں

اگر کوئی شخص یہ مطالبہ شروع کردے کہ اس کا معاشی بوجھ ایک بالکل اجنبی شخص پر ڈال دیا جائے تو دنیا اسے مذاق یا عقل کا فتور سمجھے گی، اس لیے کہ کسی فرد پر دوسرے فرد کی کوئی ذمہ داری ڈالنے کے لیے کوئی معقول بنیاد ہونی چاہیے۔ دو اجنبی اشخاص کے

---

[۱] جس مقدمہ میں یہ فیصلہ ہوا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ محمد احمد خاں کی شادی ۱۹۳۲ء میں شاہ بانو بیگم سے ہوئی۔ازدواجی زندگی کے ۴۳ سال بعد ۱۹۷۵ء میں شوہر نے بیوی کو اپنے گھر سے نکال دیا، اپریل ۷۸ء میں شاہ بانو بیگم نے اپنے شوہر کے خلاف اندور (مدھیہ پردیش) کے جوڈیشیل مجسٹریٹ کی عدالت میں ضابطہ فوج داری کی دفعہ ۱۲۵ کے تحت عذر داری داخل کردی۔ جس میں پانچ سو روپے ماہانہ کے حساب سے نان ونفقہ دلانے کی درخواست کی گئی تھی۔ ۶رنومبر ۷۸ء کو محمد احمد خاں نے شاہ بانو بیگم کو طلاق مغلظہ دے دی۔ مدعی علیہا کے نفقہ کی درخواست کے جواب میں محمد احمد خاں کی دلیل یہ تھی کہ طلاق مغلظہ کے بعد مدعیٰ علیہا کی حیثیت بیوی کی نہیں رہی، اس لیے اس پر نان ونفقہ ادا کرنے کی ذمہ داری عاید نہیں ہوتی۔ اگست ۱۹۷۹ء میں جوڈیشیل مجسٹریٹ نے اپنا فیصلہ دیتے ہوئے محمد احمد خاں کو نفقہ کے طور پر ۲۵ روپے ماہانہ شاہ بانو کو دینے کی ہدایت کی۔ محمد احمد کی طرف سے مجسٹریٹ کے فیصلے پر نظر ثانی کی درخواست مدھیہ پردیش ہائی کورٹ میں داخل کی گئی۔ ہائی کورٹ نے جوڈیشیل مجسٹریت کے فیصلہ کو نہ صرف برقرار رکھا بلکہ بطور نفقہ ادا کی جانے والی رقم ۲۵ روپے سے بڑھا کر ۱۷۹ روپے ۲۰ پیسے مقرر کردی۔ ہائی کورٹ کے اس فیصلے کے خلاف محمد احمد خاں نے سپریم کورٹ میں خصوصی اپیل دائر کی۔ پانچ نفری آئینی بنچ نے اس خصوصی اپیل پر طویل سماعت کے بعد مدھیہ پردیش ہائی کورٹ کے فیصلے کی توثیق کرتے ہوئے اپیل خارج کردی اور اس فیصلہ کو برقرار رکھا کہ مطلقہ مسلم بیوی کو عدت گزرنے کے بعد بھی نان ونفقہ کے مطالبہ کا حق حاصل ہے۔

یہ فیصلہ اپریل ۸۵ء میں منظر عام پر آیا۔

(ہفت روزہ 'دعوت' مسلم پرسنل لا نمبر مورخہ ۱۶رجون ۸۵ء کے مضمون 'مقدمہ کا تعارف' سے ماخوذ)

محترمہ شاہ بانو قابل صد ستائش ہیں کہ جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ عدالت عالیہ کا فیصلہ گو ان کے حق میں ہوا ہے لیکن یہ خدا کے قانون کے خلاف ہے تو انھوں نے عدالت سے اس فیصلہ کو واپس لینے کا مطالبہ کرکے ایک قابل تقلید مثال قائم کردی ہے۔ (قومی آواز، نئی دہلی ۱۶رنومبر ۸۵ء)

درمیان اس طرح کی بنیاد نہیں ہوتی۔ اسلام کے نزدیک جن بنیادوں پر ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں ان میں سے ایک بنیاد نکاح ہے۔ نکاح کے بعد عورت ازدواجی زندگی کے وسیع تقاضوں کی تکمیل اور خاندان کی تعمیر کے لیے مرد کو اپنا وقت دیتی اور اپنی صلاحیت صرف کرتی ہے، مرد اس کے عوض اس کے نان و نفقہ کی ذمہ داری اٹھاتا ہے۔ جب تک دونوں عقد نکاح میں بندھے ہوئے ہیں یہ ذمہ داری باقی رہتی ہے۔ طلاق سے میاں بیوی کا یہ تعلق ٹوٹ جاتا ہے اس کے ساتھ ہی مرد اس کی معاشی ذمہ داری سے سبک دوش ہو جاتا ہے اور دونوں کے درمیان ایک طرح کی دوری اور اجنبیت حائل ہو جاتی ہے۔ اگر طلاق مغلظہ ہے تو یہ اجنبیت اتنی سخت ہوتی ہے کہ عورت جتنی آسانی سے دوسرے مرد سے اور مرد دوسری عورت سے شادی کر سکتا ہے، اتنی آسانی سے یہ دونوں دوبارہ اپنے ازدواجی تعلقات بحال نہیں کر سکتے۔ وہ ان تعلقات کو بحال کرنا چاہیں تو ضروری ہے کہ عورت کی کسی دوسرے شخص سے شادی ہو اور وہ طلاق دے دے یا اس کا انتقال ہو جائے۔ اس کے بغیر وہ چاہیں بھی تو اپنی سابقہ زندگی کی طرف لوٹ نہیں سکتے۔ طلاق کے ذریعہ جہاں اتنی زبردست دوری پیدا ہو جائے اور اجنبیوں سے بھی زیادہ اجنبیت حائل ہو جائے وہاں ان میں سے کس پر کس کے حقوق عائد کیے جائیں اور کون کس کی ذمہ داری اٹھائے؟

۲- میاں بیوی کے درمیان طلاق کی نوبت بالعموم اس وقت آتی ہے جب کہ وہ اپنی ذمہ داریوں سے غفلت برتتے ہیں اور ایک دوسرے کے حقوق نہیں پہچانتے۔ اس کی وجہ سے خانگی زندگی میں تعاون اور اشتراک باقی نہیں رہتا اور عدم تعاون اور مخالفت شروع ہو جاتی ہے، لیکن طلاق کا ذکر اس طرح کیا جاتا ہے جیسے لازماً یہ مرد کی ایک زیادتی ہے اور عورت کا اس میں کوئی قصور نہیں ہے۔ حالاں کہ اس امکان کو بالکل نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ عورت نے ایسے حالات پیدا کر دیے ہوں کہ مرد کو مجبوراً طلاق دینی پڑی ہو۔ اس کے باوجود مرد پر مطلقہ کا تاحیات نفقہ لازم قرار دینا اس کے ساتھ

بہت بڑی زیادتی ہے جس کا کوئی اخلاقی اور قانونی جواز نہیں ہے۔

۳- طلاق کے بعد جس طرح عورت مرد کے ساتھ تعاون کے لیے آمادہ نہیں ہوتی اسی طرح مرد بھی فطری طور پر یہ چاہتا ہے کہ وہ عورت کی ساری ذمہ داریوں سے سبک دوش ہو جائے۔ اگر طلاق کے بعد عورت کی معاشی ذمہ داری اس پر برقرار ہے تو بعض اوقات طلاق نہ دینا اس کے لیے طلاق دینے سے زیادہ مفید ہو سکتا ہے۔ طلاق دے کر بھی بیوی کی زندگی بھر اس کی معاشی ذمہ داری اٹھانے کی جگہ وہ اس بات کو ترجیح دے سکتا ہے کہ طلاق نہ دے کر اسے معلّقہ بنائے رکھے اور عملاً تمام حقوق سے محروم کر دے۔ بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ معلقہ عدالت سے حقوق حاصل کر سکتی ہے۔ لیکن ایک تو عدالت سے کسی حق کا حاصل کرنا آسان نہیں ہے، دوسرے یہ کہ مرد اس سے بچنا چاہے تو ہزار تدبیریں کر سکتا ہے، تیسرے یہ کہ یہ کون سی دانش مندی ہے کہ مطلقہ کے نفقہ کو لازم کر کے طلاق کو اس قدر دشوار کر دیا جائے کہ آدمی طلاق کے بعد نفقہ کے ڈر سے طلاق ہی نہ دے اور بیوی کو لٹکائے رکھے؟ ایک غلطی کو باقی رکھنے کے لیے دوسری غلطی کا ارتکاب کرنا کوئی معقول بات تو نہیں ہے۔

۴- طلاق کے بعد عورت اور مرد دونوں کو یہ آزادی حاصل ہو جاتی ہے کہ وہ اپنی مرضی سے کسی دوسرے فرد کو اپنا رفیقِ حیات بنا لیں اور طلاق کی وجہ سے زندگی میں جو خلا پیدا ہو گیا ہے اسے پُر کر لیں لیکن طلاق دینے کے بعد بھی آدمی کو بیوی کا معاشی بوجھ اُٹھانا پڑے تو وہ دوسرے نکاح کی مشکل ہی سے ہمت کر سکتا ہے۔ سابقہ بیوی اور موجودہ بیوی دونوں کے اخراجات اٹھانے کے مقابلہ میں وہ شاید تجرد کی زندگی کو ترجیح دے گا۔ اس سے اس کی سیرت و اخلاق کے خراب ہونے اور جنسی بے راہ روی کا شکار ہونے کا خطرہ ہے۔

۵- اس میں عورت کے بگاڑ کا بھی اندیشہ ہے۔ اگر عورت کو یہ یقین ہو کہ طلاق کے بعد بھی اس کا نفقہ اسے برابر ملتا رہے گا تو اس کے اندر مرد کو بات بات پر

تنگ کرنے اور ذرا ذرا سی شکایت پر طلاق حاصل کرنے کا رجحان اُبھر سکتا ہے۔ چناں چہ مغرب میں طلاق کا اوسط جن اسباب کی بنا پر بہت بڑھ گیا ہے ان میں ایک یہ بھی ہے کہ عورت کو یہ اطمینان ہوتا ہے کہ وہ طلاق کے بعد بھی (Maintenance) کے نام پر زندگی بھر شوہر سے اپنا خرچ وصول کرتی رہے گی۔ اسلام طلاق کے رُجحان کو غلط سمجھتا ہے۔ وہ ایسے کسی قاعدہ ضابطہ کی تائید ہرگز نہیں کرسکتا جس سے اس رُجحان کو تقویت ملے اور ازدواجی زندگی کی ہر ناگواری کو طلاق کے ذریعہ دور کیا جانے لگے۔

۶- ایک اور پہلو بھی ہے۔ وہ یہ کہ طلاق سے عورت اور مرد ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد بھی نفقہ جاری رہنے سے فطری طور پر یہ اجنبیت کم ہوتی چلی جاتی ہے۔ پرانے زخم مندمل ہونے لگتے ہیں، ملاقاتیں شروع ہو جاتی ہیں، دونوں طرف سے ہم دردی اور محبت کا اظہار ہونے لگتا ہے اور بے تکلفی بڑھنے لگتی ہے۔ ان کے درمیان جنسی تعلقات میں چوں کہ پہلے سے کسی قسم کا حجاب موجود نہیں ہوتا اس لیے بسا اوقات یہ بے تکلفی اور میل جول غلط رُخ اختیار کرنے لگتی ہے۔ ایک ایسی صورتِ حال کا باقی رہنا جس میں اخلاقی بگاڑ کا سخت اندیشہ ہو کسی طرح صحیح نہیں ہے۔

اس کے جواب میں کہا جاسکتا ہے کہ اس بات کا انتظام ہوسکتا ہے کہ دونوں میں براہِ راست تعلقات پیدا نہ ہوں۔ لیکن کم از کم جہاں دونوں ایک مقام پر رہتے ہوں وہاں یہ بہت دشوار ہے۔ اس کے بڑے غلط نتائج دیکھنے میں آتے رہتے ہیں بلکہ یہ بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ بغیر کسی روک ٹوک کے دونوں ساتھ رہنے لگتے ہیں اور معاشرہ بھی اسے برداشت کر لیتا ہے۔ شریعت کے مزاج کا تقاضا یہ ہے کہ کسی شخص کے لیے ایسے حالات نہ پیدا کیے جائیں کہ وہ بے راہ روی میں آگے نکلتا چلا جائے اور اسے اس کا احساس بھی نہ ہو۔

یہ بعض وہ معاشرتی اور سماجی پیچیدگیاں ہیں جو مطلقہ کا نفقہ واجب قرار دینے سے پیدا ہوسکتی ہیں۔ ان پیچیدگیوں کو نظر انداز کرنا آسان نہیں ہے۔

مطلقہ کے حقوق

بعض لوگ چاہتے ہیں کہ طلاق کے بعد عورت کے تاحیات نفقہ کو کسی نہ کسی طرح قرآن سے ثابت کر دکھائیں۔ لیکن بڑی مشکل یہ ہے کہ قرآن مجید ان کی اس خواہش کو پوری کرنے کے لیے ہرگز تیار نہیں ہے۔ طلاق کی صورت میں عورت کے مہر، نفقہ اور عدت کے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ قرآن و حدیث میں ان کے احکام موجود ہیں، لیکن ان میں مطلقہ کے تاحیات نفقہ کا کہیں ذکر نہیں ہے۔

مہر

مہر کے مسئلہ پر اس سے پہلے بحث گزر چکی ہے۔ اس کی چار شکلیں ہیں۔ مہر متعین ہے اور عورت سے خلوت صحیحہ ہو چکی ہے تو اسے پورا مہر ملے گا، مہر متعین نہیں ہے اور خلوت ہو چکی ہے تو عورت مہر مثل کی حق دار ہوگی، مہر متعین تو ہے لیکن خلوت صحیحہ نہیں ہوئی ہے تو نصف مہر ملے گا، اگر مہر بھی متعین نہیں ہے اور خلوت بھی نہیں ہوئی ہے تو اسے متاع دیا جائے گا۔[1]

عدت کی تعیین

جہاں تک زمانہ عدت کا تعلق ہے، اس کی تعیین بھی قرآن مجید نے کردی ہے۔ اگر خلوت صحیحہ کے بعد طلاق ہوئی ہے تو عدت تین حیض ہے۔ (البقرہ:۲۲۸)

جس عورت کو صغرسنی کی وجہ سے یا بڑھاپے کی وجہ سے حیض نہ آئے اس کی عدت تین ماہ ہے اور حاملہ کی عدت وضعِ حمل ہے۔ (الطلاق:۴)

اگر خلوت صحیحہ سے پہلے ہی طلاق ہو چکی ہے تو اس کی کوئی عدت نہیں ہے۔[2] (الاحزاب:۴۹)

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو اسی کتاب میں 'مہر کی نوعیت اور اس کے احکام'۔

[2] ملاحظہ ہو اسی کتاب میں 'طلاق کا مسئلہ'

عدت تک نفقہ

اب نفقہ اور سکنیٰ (مکان) کے مسئلہ کو لیجیے۔

طلاق دو طرح کی ہوتی ہے۔ رجعی، جس میں شوہر کو رجوع کا حق ہوتا ہے۔ بائن جس میں رجوع کا حق ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے مختصر احکام یہ ہیں:

۱- طلاق رجعی ہو تو فقہاء کا اتفاق ہے کہ عورت کو نفقہ اور سکنیٰ (مکان) دونوں ملیں گے۔

۲- فقہاء کا اس پر بھی اتفاق ہے کہ عورت اگر حاملہ ہے تو اس کا نفقہ اور سکنیٰ واجب ہے۔ چاہے طلاق رجعی ہو یا بائن۔ قرآن مجید کا ارشاد ہے:

وَاِنْ كُنَّ اُولاَتِ حَمْلٍ فَاَنْفِقُوْا عَلَيْهِنَّ حَتّٰى يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ	اگر وہ حاملہ ہوں تو ان پر اس وقت تک خرچ کرو جب تک ان کا وضع حمل نہ
(الطلاق:٦)	ہو جائے۔

۳- اگر عورت حاملہ نہیں ہے اور طلاق بائنہ ہے تو امام احمد، داؤد ظاہری اور ابوثور وغیرہ کی رائے یہ ہے کہ شوہر پر نہ تو اس کا نفقہ واجب ہے اور نہ سکنیٰ۔ ان حضرات کی دلیل حضرت فاطمہ بنت قیس کی روایت ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ میرے شوہر نے مجھے طلاق بائن دے دی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا لَيْسَ لَكِ عَلَيْهِ نَفَقَةٌ[1] (تمھارے شوہر پر تمہارا نفقہ واجب نہیں ہے) ایک اور روایت کے الفاظ ہیں لاَ نَفَقَةَ لَكِ وَلاَ سُكْنىٰ[2] (تمھیں نہ نفقہ ملے گا اور نہ سکنیٰ)

امام مالک اور امام شافعی وغیرہ فرماتے ہیں کہ قرآن مجید نے اس کے سکنیٰ کا ذکر کیا ہے (الطلاق:٦) لہٰذا اسے سکنیٰ تو ملے گا نفقہ نہیں ملے گا۔

---

۱ مسلم، کتاب الطلاق، باب المطلقہ البائن لا نفقۃ لہا

۲ حوالہ سابق

ابن رُشد، مسلک کے لحاظ سے مالکی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ اسے ایک کم زور رائے قرار دیتے ہیں[۱] اس معاملہ میں احناف کا مسلک زیادہ قوی معلوم ہوتا ہے۔

۳۔ احناف اور بعض دوسرے علماء کی رائے یہ ہے کہ طلاق چاہے رجعی ہو یا بائن عورت کو نفقہ اور سکنیٰ دونوں ملیں گے۔ احناف کی دلیل یہ ہے کہ قرآن نے مطلقہ کے لیے سکنیٰ کا صراحت کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ نفقہ اسی کے تابع ہے۔ قرآن نے اس بات کا پابند بنایا ہے کہ آدمی طلاق کے بعد عدت تک عورت کو گھر میں رکھے، لہٰذا اس کا خرچ بھی فطری طور پر اسی کو اُٹھانا چاہیے۔ سکنیٰ کی بنیاد پر بیوی کا نفقہ بھی آدمی پر لازم آتا ہے۔ آیت کے الفاظ سے اسی کی تائید ہوتی ہے۔

اَسْكِنُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ مِّنْ وُّجْدِكُمْ وَلَا تُضَآرُّوْهُنَّ لِتُضَيِّقُوْا عَلَيْهِنَّ (الطلاق:۶)	ان عورتوں کو اپنی وسعت کے موافق رہنے کا مکان دو جہاں تم رہتے ہو۔ اور ان کو تنگ کرنے کے لیے تکلیف نہ پہنچاؤ۔

جصاص کہتے ہیں کہ آیت کے الفاظ عام ہیں۔ یہ مطلقہ رجعیہ اور مطلقہ بائنہ دونوں سے متعلق ہیں۔ مِنْ وُّجْدِكُمْ (اپنی وسعت اور طاقت کے لحاظ سے[۲]) کے الفاظ بتاتے ہیں کہ شوہر کے مال میں مطلقہ کا سکنیٰ واجب ہے۔ اس کا تقاضا ہے کہ مال میں نفقہ بھی واجب ہو اس لیے کہ سکنیٰ نفقہ کا ایک حصہ ہے۔ دوسرے یہ ہدایت کہ ان کو تنگ کرنے کے لیے تکلیف نہ پہنچاؤ۔ تنگ کرنا اور تکلیف پہنچانا یہ دونوں باتیں جس طرح سکنیٰ سے متعلق ہیں نفقہ سے بھی متعلق ہیں[۳]

فاطمہ بنت قیس کی روایت کا یہ جواب دیا گیا ہے کہ اسے حضرت عمرؓ نے قبول نہیں کیا اور فرمایا۔

---

[۱] بدایۃ المجتہد: ۱۰۳/۲

[۲] زمخشری کہتے ہیں۔ الوجد، الوسع والطاقۃ۔ الکشاف: ۱۴۹۷/۲

[۳] جصاص، احکام القرآن ۵۶۵/۳

لانترک کتاب الله و سنة نبينا صلی الله علیه وسلم لقول امرأة لا ندری لعلها حفظت او نسیت لها السکنی و النفقة[1]	ہم اللہ کی کتاب اور اپنے نبی ﷺ کی سنت کو ایک عورت کے بیان کی وجہ سے چھوڑ نہیں سکتے۔ معلوم نہیں اس نے اسے (ٹھیک سے) یاد بھی رکھایا بھول گئی۔ مطلقہ کے لیے سکنیٰ (مکان) بھی ہے اور نفقہ بھی۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کے نزدیک کتاب وسنت سے مطلقہ کا نفقہ اور سکنیٰ دونوں ثابت ہے[2]

اس لیے یہ مسئلہ بالکل واضح ہے کہ مطلقہ کا اس کی عدت تک نفقہ اور سکنیٰ شوہر پر واجب ہے۔ عدت کے بعد نفقہ یا سکنیٰ کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔

مطلقہ کے لیے متاع

جو لوگ قرآن مجید سے مطلقہ کے نفقہ کو ثابت کرنا چاہتے ہیں وہ سورۂ بقرہ کی آیت ۲۴۱ سے استدلال کرتے ہیں وہ آیت یہ ہے:

وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ۝	جن عورتوں کو طلاق دی گئی انھیں دستور کے مطابق متاع دینا ہے۔ یہ حق ہے متقیوں پر۔

اس آیت سے یہ استدلال کیا جاتا ہے کہ اس میں مطلّقات کے لیے مہر کے علاوہ 'متاع' دینے کا حکم دیا گیا ہے۔ طلاق کے بعد جب تک عورت زندہ ہے اسے یہ متاع ملنا چاہیے تاکہ وہ اس سے گزر بسر کر سکے۔ قرآن مجید نے 'متاع' کا حکم تو دیا ہے لیکن اس کی تعیین نہیں کی ہے۔ اسے رواج اور دستور پر چھوڑ دیا ہے۔ اس کا مطلب یہ

---

[1] مسلم، کتاب الطلاق، باب المطلقہ البائن لانفقۃ لہا

[2] اس مسئلہ پر تفصیلی بحث کے لیے ملاحظہ ہو۔ بدایۃ المجتہد: ۱۰۲/۲، ۱۰۳۔ جصاص، احکام القرآن: ۵۶۴/۳-۵۷۰۔ ابن قدامہ، المغنی: ۶۰۶/۷، ۶۱۰

ہے کہ اسے حسب حالات متعین کیا جاسکتا ہے۔ ان کے خیال میں اگر اسے تاحیات یا تا نکاح ثانی نفقہ کی شکل میں متعین کیا جائے تو یہ قرآن کے منشا کے مطابق ہوگا اس کے خلاف نہیں ہوگا۔ اس کی ادائیگی یک مشت بھی ہوسکتی ہے اور قسطوں میں بھی لیکن اسے لازم بہرحال ہونا چاہیے۔

'متاع' کے اس عجیب وغریب معنی کی تائید نہ تو لغت عرب سے ہوتی ہے، نہ قرآن مجید کے سیاق وسباق سے۔ صحابہ وتابعین اور فقہاء امت نے بھی اس کے یہ معنی نہیں لیے ہیں۔ مذکورہ بالا آیت میں مطلقہ کے لیے جس 'متاع' یا 'متعہ' کا ذکر کیا گیا ہے اسے اچھی طرح سمجھنے کے لیے حسب ذیل سوالات پر غور کرنا ہوگا۔

۱- 'متاع' کیا ہے؟
۲- اس کی حیثیت اخلاقی ہے یا قانونی؟
۳- قانونی ہے تو کیا یہ ہر قسم کی مطلقہ کے لیے ہے یا بعض مطلّقات کے لیے؟

متاع کا لغوی مفہوم

'متاع' لغت میں تھوڑے سے ساز وسامان کو اور اس چیز کو جس سے وقتی طور پر فائدہ اٹھایا جائے، کہا جاتا ہے۔ ازہری کہتے ہیں۔

المتاع فی اللغة کل ما انتفع به فهو متاع[1]	متاع لغت میں ہر اس چیز کو کہا جاتا ہے جس سے فائدہ حاصل کیا جائے۔

امام راغب کہتے ہیں۔

المتاع انتفاع ممتد لوقت[2]	ایک خاص وقت تک فائدہ اٹھانا 'متاع' ہے۔

مزید فرماتے ہیں۔

---

۱ لسان العرب مادہ 'متع'
۲ المفردات فی غریب القرآن: مادہ متع

كل ما ينتفع به على وجه ما فهو متاع و متعة[1]

ہر وہ چیز جس سے کسی بھی نوعیت کا فائدہ اٹھایا جائے 'متاع' یا متعہ ہے۔

امام رازی فرماتے ہیں۔

اصل المتعة والمتاع ما ينتفع به انتفاعا غير باقٍ[2]

'متعہ' اور 'متاع' اصل میں اس چیز کو کہا جاتا ہے جس سے ایسا فائدہ اٹھایا جائے جو باقی رہنے والا نہیں ہے بلکہ جلد ہی ختم ہونے والا ہے۔

قرآن میں لفظ متاع کا استعمال

قرآنِ مجید میں 'متاع' کا اطلاق مختلف چیزوں پر ہوا ہے۔ گھر کے اندر استعمال ہونے والی اشیاء۔ چناں چہ اجنبی اشخاص کو ازواج مطہرات سے ایسی کوئی چیز لینے کا طریقہ یہ بتایا گیا ہے۔

وَإِذَا سَأَلْتُمُوهُنَّ مَتَاعًا فَسْئَلُوهُنَّ مِنْ وَّرَاءِ حِجَابٍ ط (الاحزاب:۵۳)

جب تم ان سے کوئی چیز مانگو تو ان سے پردہ کے پیچھے سے مانگو۔

دھات سے بنی ہوئی چیزیں جیسے برتن اور اوزار وغیرہ۔

وَمِمَّا يُوقِدُونَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ ابْتِغَآءَ حِلْيَةٍ اَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثْلُهُ (الرعد:۱۷)

جن دھاتوں کو یہ آگ میں تپاتے ہیں زیور بنانے یا کسی بھی سامان کے لیے اسی طرح جھاگ ہوتا ہے۔

سورۂ یوسف میں ایک جگہ یہ لفظ پیالے یا پیمانے کے معنی میں استعمال ہوا ہے (۷۹) اسی سورہ میں شکاری کے ساز و سامان کے معنی میں آیا ہے (۱۷) سورۂ مائدہ میں

---

[1] حوالہ سابق

[2] تفسیر کبیر: ۲/۲۸۴

سمندر کے شکار- مچھلی وغیرہ- کو 'متاع' کہا گیا ہے (۹٦)۔

اس طرح کی چھوٹی چھوٹی چیزوں کے ساتھ زندگی کے ان تمام اسباب کو بھی 'متاع' کہا گیا ہے جن سے انسان اس زندگی میں فائدہ اٹھاتا ہے۔ ارشاد ہے۔

وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّ مَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ (البقرہ:۳٦)	اور تمہارے لیے زمین میں ٹھکانا ہے اور فائدہ اٹھانا ہے ایک خاص وقت تک۔

پوری دنیا کو اس کے تمام ساز و سامان، زر و جواہر اور اسبابِ آسائش و راحت کے باوجود 'متاع' کہا گیا ہے۔

وَ اِنْ كُلُّ ذٰلِكَ لَمَّا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةُ عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُتَّقِيْنَ (الزخرف:۳۵)	یہ ساری چیزیں تو دنیا کی زندگی کی متاع ہیں اور آخرت تمھارے رب کے نزدیک متقیوں کے لیے ہے۔

یہاں آخرت کے مقابلے میں حیاتِ دنیا کو 'متاع' کہا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آخرت کی ابدی زندگی اور وہاں کی نعمتوں کو سامنے رکھا جائے تو دنیا ایک 'متاع' اور وہ بھی 'متاع قلیل' ہے۔

وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا مَتَاعٌ (الرعد:۲٦)	دنیا کی زندگی آخرت کے مقابلہ میں محض حقیر متاع ہے۔

ایک دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِيْلٌ (التوبہ:۳۸)	دنیا کی زندگی تو آخرت کے مقابلہ میں بہت تھوڑی سی ہے۔

متاعِ طلاق

اب یہ دیکھیے کہ 'متاع طلاق' کے کیا معنیٰ ہیں؟ قرآن مجید نے 'متاع طلاق'

کا حکم بغیر کسی قید کے مطلق دیا ہے۔ اس نے یہ نہیں بتایا کہ 'متاع' سے اس کی کیا مراد ہے؟ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اگر 'متاع' کو ضروری بھی قرار دیا جائے تو 'طلاق' کے وقت کوئی بھی چھوٹی بڑی چیز عورت کو دے دینے سے اس کا تقاضا پورا ہو جاتا ہے۔

اُن ماہرین لغت نے جنھوں نے خاص طور پر قرآن اور حدیث کے الفاظ کی تحقیق کی ہے 'متاع طلاق' کے معنی یہ نہیں لیے ہیں کہ مطلقہ کو تاحیات نفقہ دیا جائے یا کسی خاص مدت تک اس کے اخراجات برداشت کیے جائیں۔ ان کے نزدیک اس کے معنی یہ ہیں کہ عورت کی دل جوئی کے لیے کچھ دے دلا دیا جائے۔

امام راغب الفاظِ قرآن کے بلند پایہ محقق ہیں 'متاعِ طلاق' کے بارے میں فرماتے ہیں۔

... فالمتاع والمتعة ما يعطى المطلقة لتنتفع به مدة عدتها[1]	شوہر اپنی مطلقہ کو عدت کے زمانہ میں فائدہ اٹھانے کے لیے جو دیتا ہے وہ متاع یا متعہ ہے۔

(الرعد:۲۶)

گویا وہ عدت کے زمانے کے نفقہ ہی کو 'متاع' سمجھتے ہیں اس کے علاوہ کسی 'متاع' کا قانونی طور پر اسے مستحق قرار نہیں دیتے (اس مسئلہ میں فقہاء کی رائیں آگے آ رہی ہیں)

الفاظِ حدیث کے بہت بڑے ماہر علامہ ابن اثیر نے 'متاع طلاق' کی تشریح ان الفاظ میں کی ہے:

ويستحب للمطلق ان يعطى امرأته عند طلاقها شيئا يهبها اياه[2]	طلاق دینے والے کے لیے یہ پسندیدہ ہے کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دیتے وقت کوئی چیز اسے ہبہ کر دے۔

---

[1] المفردات فی غریب القرآن مادہ 'متع'

[2] النہایہ فی غریب الحدیث: ۴/۲۷۶ مادہ متع

علامہ سیوطی نے لغات حدیث پر ابن اثیر کی کتاب کی تلخیص کی ہے اس میں وہ فرماتے ہیں:

متعة الطلاق اعطائها شیئا یجبر به کسرها[1] — متعہ طلاق یہ ہے کہ عورت کو کوئی چیز دے دی جائے تا کہ اس کی دل شکنی کی تلافی ہو۔

قرآن مجید نے مطلقہ کے 'متاع' کا ذکر جس سیاق میں کیا ہے اس سے بھی اس کی مراد واضح ہو جاتی ہے۔ اس نے کہا کہ خلوت سے پہلے جس عورت کو طلاق دی جائے اگر اس کا مہر متعین ہے تو وہ نصف مہر کی مستحق ہوگی اور مہر متعین نہیں ہے تو اسے 'متاع' دیا جائے گا (البقرہ:۲۳۶،۲۳۷) اگر مہر کا تصور زندگی بھر کے نفقہ کا نہیں ہے تو 'متاع' کے اندر یہ مفہوم کہاں سے آجائے گا کہ مطلقہ کو تاحیات نفقہ فراہم کیا جائے؟

متاع سے نفقہ مراد نہیں لیا جاسکتا

یوں بھی اس لفظ سے تا حیات نفقہ مراد نہیں لیا جاسکتا۔ اس کی دو وجہیں ہیں۔

۱۔قرآن مجید نے صراحت کر دی ہے کہ طلاق کے بعد عدت تک عورت کا نفقہ اور سکنیٰ (مکان) مرد پر واجب ہے۔ اس کے بعد اس کی ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے باوجود مرد پر نفقہ کو مطلقہ کے نکاح ثانی یا موت تک واجب قرار دینا قرآن کے حکم پر ایک اضافہ ہے جو صحیح نہیں ہے۔ جس ذمہ داری سے اللہ تعالیٰ نے بہت سی مصلحتوں کے پیش نظر مرد کو سبک دوش کیا ہے وہی ذمہ داری اس پر دوبارہ عائد کرنا ان مصلحتوں کو پامال کرنا ہے۔

۲۔ اس سے پہلے یہ بحث گزر چکی ہے کہ نکاح کے بعد عورت کے نان و نفقہ کی ذمہ داری مرد پر اس لیے عائد ہوتی ہے کہ وہ خاندان کی تعمیر کے لیے اسے اپنے سارا وقت دیتی ہے۔ طلاق کے بعد جب عورت آزاد ہوگئی اور اس کے اوقات پر مرد کا کوئی قبضہ نہیں رہا تو پھر نفقہ کس بنیاد پر واجب ہوگا؟

---

[1] الدر النثیر علی ہامش النہایہ مادہ 'متع'

صحابہ و تابعین کی رائے

اب آیئے اس معاملہ میں صحابہ و تابعین کی رائے اور ان کا طرزِ عمل دیکھا جائے۔

حضرت عبد اللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ مطلقہ کے متاع کا سب سے اعلیٰ معیار یہ ہے کہ اسے خادم دیا جائے۔ اس سے کم تر یہ ہے کہ ایک جوڑا لباس (جس میں تین کپڑے ہوں) دیے جائیں۔ آخری چیز یہ ہے کہ تھوڑی سی چاندی (رقم) دی جائے۔ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ اس کی مقدار کم سے کم تیس درہم ہونی چاہیے۔

تابعین میں قاضی شریح نے متاع کو پانچ ہزار درہم بتایا ہے۔ امام شعبی نے اسے گھر کے اندر کا پورا لباس، لحاف اور جلباب (چادر) کہا ہے۔ حضرت حسن بصری کہتے ہیں کہ متعہ کی کوئی مقدار متعین نہیں ہے۔ آدمی اپنی حیثیت کے مطابق یہ دے گا۔ عطاء بن ابی رباح نے بھی یہی بات کہی ہے۔

ایسی مثالیں بھی موجود ہیں کہ بعض بزرگوں نے مطلقہ کا خوش دلی سے بہت زیادہ تعاون کیا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عوفؓ نے اپنی بیوی تماضر کو طلاق دی تو اسے متاع میں ایک سیاہ فام لونڈی دی۔

حضرت حسنؓ کے بارے میں آتا ہے کہ انھوں نے اپنی ایک بیوی کو طلاق دی تو اسے متاع کے طور پر دس ہزار درہم دیے[1]

اس طرح کی اور مثالیں بھی مل سکتی ہیں۔ ان کی حیثیت حسن سلوک اور ایک طرح کے احسان کی ہے۔ اسے قانون نہیں بنایا جاسکتا۔

---

[1] ان اقوال کے لیے ملاحظہ ہو ابن جریر، تفسیر: ۲/۳۰۴-۳۰۵، ابن کثیر، تفسیر: ۲۸۸۔ ابن حزم، المحلیٰ: ۱۰/۲۴۸

فقہاء کا نقطۂ نظر

فقہائے کرام نے اپنے حالات کے لحاظ سے اس کے تعیین کی کوشش کی ہے۔

فقہ حنفی میں ہے کہ مطلقہ کا متاع یہ ہے کہ اسے ایک جوڑا لباس دیا جائے۔ اس میں کتنے کپڑے ہوں اس کا تعلق معاشرہ کے دستور اور رواج سے ہے۔ کپڑے کے معیار کے سلسلے میں ایک رائے یہ ہے کہ وہ شوہر کی حیثیت کے مطابق ہوگا دوسری رائے یہ ہے کہ اس میں شوہر اور بیوی دونوں کی حیثیت دیکھی جائے گی۔ اس کے ساتھ فقہاء احناف کا اس پر بھی اتفاق ہے کہ یہ متاع مہرِ مثل کے نصف سے زیادہ نہیں ہوسکتا۔ اس لیے کہ یہ اسی کی جگہ رکھا گیا ہے اور پانچ درہم سے کم بھی نہیں ہونا چاہیے[1] (اس لیے کہ فقہ حنفی کی رو سے مہر کی مقدار کم از کم دس درہم ہونی چاہیے۔ اگر اسے مہر مثل کا نصف مان لیا جائے تو یہ ایک جوڑے سے زیادہ بھی ہوسکتا ہے)

فقہ مالکی میں کہا گیا ہے کہ بیوی کو طلاق دینے کے بعد آدمی اپنی حیثیت کے مطابق مہر کے علاوہ جو بھی دے وہ متعہ ہے[2]

امام شافعی نے متعہ کی تعیین اس طرح کی ہے۔ صاحب حیثیت کے لیے ایک خادم، اوسط درجہ کے آدمی کے لیے ایک جوڑا کپڑے۔ اس کا کم از کم درجہ یہ ہے کہ تیس درہم یا اس کی قیمت کی کوئی چیز دی جائے۔ اس کے ساتھ میاں بیوی کو اس کا حق ہے کہ وہ اس سے کم یا زیادہ پر اتفاق کرلیں۔[3]

تقریباً یہی بات فقہ حنبلی میں کہی گئی ہے کہ متعہ مرد کی حیثیت کے مطابق ہوگا۔ اس کا اعلیٰ معیار یہ ہے کہ خادم دیا جائے اور کم سے کم معیار یہ ہے کہ ایک جوڑا دیا جائے جس میں اتنے کپڑے ہوں کہ وہ نماز کے لیے کافی ہوسکیں۔ شوہر اس سے زیادہ

۱؎ رد المحتار علی الدر المختار: ۴۶۲/۲

۲؎ الشرح الصغیر: ۶۱۶/۲

۳؎ بغوی، معالم التنزیل: ۲۰۴/۱۔ خطیب شربینی، السراج المنیر: ۱۵۳/۱

بھی دے سکتا ہے اور عورت اس سے کم بھی لے سکتی ہے[1]

فقہاء کرام نے اپنے دور کو سامنے رکھ کر متاع کے تعین کی کوشش کی ہے۔ اس میں کمی بیشی ہر دور کے حالات کے لحاظ سے ہو سکتی ہے۔ قرآن و حدیث میں جس طرح مہر اور نفقہ کی کوئی حد بندی نہیں ہوئی ہے، اسی طرح متعہ کو بھی کوئی حد مقرر نہیں کی گئی ہے۔ اسے ہر دور کے حالات پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ اس معاملہ میں صحابہ و تابعین کے درمیان جو اختلاف رہا ہے اس کے بارے میں علامہ ابوبکر جصاص کہتے ہیں۔

ھذہ المقادیر کلھا صدرت عن اجتھاد آرائھم ولم ینکر بعضھم علی بعض ما صار الیہ من مخالفتہ فیہ فدل علی انھا عندھم موضوعۃ علی ما یؤدیہ الیہ اجتھادہ[2]	متعہ کی جو مقداریں بیان ہوئی ہیں وہ سب کی سب سلف کی اجتہادی رائیں ہیں، ان میں سے کسی نے اپنی رائے سے مخالف دوسرے کی رائے پر نکیر نہیں کی۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ ساری رائیں ان کے نزدیک ان میں سے ہر ایک کے اجتہاد کا نتیجہ ہیں۔

بعض فقہاء کے نزدیک متعہ کی تعیین میں عورت کی سماجی و معاشی حیثیت کا اعتبار نہیں ہوگا۔ صرف مرد کی حیثیت دیکھی جائے گی۔ اس لیے کہ قرآن نے کہا ہے کہ "صاحبِ حیثیت اپنی حیثیت کے لحاظ سے اور تنگ دست اپنی حیثیت کے لحاظ سے متاع دے۔ (البقرہ:۲۳۶)

لیکن صحیح بات یہ ہے کہ اس میں عورت اور مرد دونوں کی حیثیت پیش نظر رکھی جائے گی۔ جصاصؒ کہتے ہیں کہ متعہ کی تعیین میں معروف کی پابندی کا حکم دیا گیا ہے۔ یہ بات معروف کے خلاف ہے کہ اس میں عورت کی حیثیت کی رعایت نہ کی جائے اور ایک خوش حال گھرانے کی عورت کو وہی متعہ دیا جائے جو ایک غریب خاندان کی عورت کو

---

[1] ابن قدامہ: المغنی ۶/۶/۷

[2] احکام القرآن: ۱/۵۱۵

دیا جاتا ہے۔"[۱]

اس پوری بحث سے اتنی بات واضح ہے کہ 'متاع' دراصل اس ساز و سامان کو کہا جاتا ہے جو طلاق کے وقت حسب حیثیت عورت کی دل جوئی کے لیے دیا جاتا ہے۔ اسے بڑھا کر پوری زندگی کا نفقہ بنا دینا اس لفظ کے ساتھ ایسی کھلی زیادتی ہے کہ اس کی کسی سنجیدہ آدمی سے توقع نہیں کی جاسکتی۔

متاع کی حیثیت اخلاقی ہے یا قانونی؟

اب اس سوال کو لیجیے کہ متاع کی حیثیت اخلاقی ہے یا قانونی؟

اس مسئلہ میں امام مالک کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ جس عورت کو طلاق دی جائے اسے متعہ دینا مندوب (پسندیدہ) ہے فرض نہیں ہے۔ ان کی دلیل 'حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ' کے الفاظ ہیں جو آیت کے آخر میں آئے ہیں۔ اس سے پہلے آیت نمبر ۲۳۶ میں متعہ کو 'حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ' (نکو کاروں پر حق ہے) کہا گیا ہے۔ جو چیز تقویٰ اور احسان کی علامت ہے اسے ہم سب پر فرض قرار نہیں دے سکتے۔[۲]

تابعین میں قاضی شریح کی یہی رائے تھی۔ روایت میں آتا ہے کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو جس سے خلوت ہو چکی تھی طلاق دی۔ قاضی شریح کی عدالت میں اس عورت نے متعہ کا دعویٰ کیا تو انھوں نے اس کے شوہر سے کہا کہ محسنین کے زمرے میں شامل ہونے سے اور متقیوں کے زمرہ میں شامل ہونے سے انکار نہ کرو۔ اسے متعہ دینے پر مجبور نہیں کیا۔[۳]

امام مالک کے نزدیک خلوت سے پہلے جس عورت کی طلاق ہو جائے اور اس کا مہر متعین ہو اسے نصف مہر ملے گا اس کے لیے متعہ نہیں ہے۔

۱۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو احکام القرآن: ۱/۵۱۳-۵۱۵

۲۔ احمد الدردیر، الشرح الصغیر: ۲/۲۱۷-۲۱۸

۳۔ بغوی، معالم التنزیل علی ہامش الخازن: ۱/۲۰۴

امام مالک کی ایک رائے یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ متعہ واجب ہے لیکن معروف رائے وہی ہے جو اوپر بیان ہوئی ہے[1]

فقہاء کی اکثریت نے مطلقہ کے لیے متاع کو واجب قرار دیا ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ قرآن نے بصیغۂ امر اس کا حکم دیا ہے مَتِّعُوْهُنَّ (البقرہ:۲۳۶-الاحزاب:۴۹) انھیں متاع دو۔ جب تک کوئی مضبوط قرینہ نہ ہو صیغۂ امر سے وجوب ہی سمجھا جائے گا۔

قرآن نے فرمایا وَلِلْمُطَلَّقَاتِ مَتَاعٌ (مطلّقات کے لیے متاع ہے) اس سے بھی وجوب ہی ثابت ہوتا ہے۔ وَلِلْمُطَلَّقَاتِ (مطلّقات کے لیے) یہ لفظ بتاتا ہے کہ متاع ان کی ملکیت ہوگی اور وہ اس کا مطالبہ کرسکیں گی۔

حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ (متقیوں پر حق ہے) کے الفاظ بھی وجوب پر دلالت کرتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ متعہ متقیوں پر فرض ہے اسی کی تاکید کے طور پر فرمایا 'حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ' (محسنوں پر حق ہے)۔

کیا اس کے معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ یہ صرف متقیوں یا محسنوں پر فرض ہے۔ دوسروں پر فرض نہیں ہے؟ اس کے جواب میں علامہ ابو بکر جصاص نے قرآن مجید کے نظائر سے ثابت کیا ہے کہ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جو متقی اور محسن نہیں ہیں ان پر یہ فرض نہیں ہے بلکہ اس انداز سے اس حکم میں زیادہ زور پیدا ہو جاتا ہے کہ آدمی اس پر عمل کر کے نیک لوگوں کے زمرہ میں شامل ہو جائے[2]

کیا ہر مطلقہ کے لیے متاع واجب ہے؟

اب سوال یہ ہے کہ متعہ واجب ہے تو کیا ہر مطلقہ کو متعہ دینا واجب ہے یا ان میں سے بعض کو متعہ دینا واجب ہے اور بعض کو دینا واجب نہیں ہے؟

اس میں فقہ حنفی کی رائے یہ ہے کہ متعہ اس مطلقہ کا واجب ہے جس کا مہر متعین

---

[1] الشرح الصغیر:۲/۶۱۷

[2] پوری بحث کے لیے دیکھیے۔ جصاص، احکام القرآن: ۵۰۸-۵۰۹

نہ ہو اور جسے خلوت صحیحہ سے پہلے طلاق دے دی جائے۔ اس لیے کہ اسی کو قرآن نے متعہ دینے کا حکم دیا ہے (بقرہ:۲۳۶) دوسری مطلّقات کو مہر اور نفقہ ملتا ہے اس لیے ان کو متعہ دینا واجب نہیں ہے۔ البتہ مندوب ہے[۱]

امام احمد کا بھی یہی مسلک ہے[۲]

امام شافعی فرماتے ہیں کہ متاع سب ہی مطلّقات کو دینا واجب ہے سوائے اس مطلقہ کے جس کا مہر متعین ہو اور جسے خلوت سے پہلے طلاق دے دی جائے۔ قرآن نے صراحت کر دی ہے کہ اسے نصف مہر ملے گا[۳] (البقرہ:۲۳۷) صحابہ میں حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کی یہی رائے بیان کی جاتی ہے[۴]

حضرت سعید بن جبیرؒ، ابو العالیہؒ، حسن بصریؒ وغیرہ کی رائے یہ ہے کہ ہر مطلقہ کو متعہ دینا واجب ہے۔ اس لیے کہ وَلِلْمُطَلَّقَاتِ مَتَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ (مطلّقات کو معروف کے مطابق متاع دینا ہے) ایک عام حکم ہے۔ اسے کسی خاص قسم کی مطلقہ کے ساتھ مخصوص کرنا صحیح نہیں ہے۔ یہ خیال بھی غلط ہے کہ صرف ان مطلّقات کو متعہ ملے گا جن کا مہر متعین نہ ہو۔ اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہرات کا مہر بھی متعین تھا اور ان سے خلوت بھی ہو چکی تھی لیکن اس کے باوجود طلاق کی صورت میں انھیں متاع دینے کا حکم ہے۔ ارشاد ہے:

يَآاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِاَزْوَاجِكَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَ زِيْنَتَهَا فَتَعَالَيْنَ اُمَتِّعْكُنَّ وَ اُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيلًا۝ (الاحزاب:۲۸)	اے نبی تم اپنی بیویوں سے کہہ دو کہ اگر تم دنیا کی زندگی اور اس کی زیب و زینت چاہتی ہو تو آؤ میں تمھیں متاع دوں اور اچھی طرح سے رخصت کر دوں۔[۵]

[۱] رد المحتار علی الدر المختار: ۲/۴۶۱-۴۶۲

[۲] تفصیل کے لیے دیکھی جائے ابن قدامہ، المغنی: ۶/۷۱۵

[۳] بدایۃ المجتہد: ۲/۱۰۵-۱۰۶

[۴] بغوی، معالم التنزیل علی ہامش الخازن: ۱/۲۰۴

[۵] ابن کثیر، تفسیر: ۱/۲۸۸

یہ رائے حضرت علیؓ، امام زہری، ابراہیم نخعی، عطاء بن ابی رباح اور سفیان ثوری سے بھی نقل کی جاتی ہے[۱]

اہلِ ظاہر کی بھی یہی رائے ہے۔ ابن حزم ظاہری کہتے ہیں کہ ہر طرح کی مطلقہ کے لیے متعہ واجب ہے، چاہے طلاق رجعی ہو یا بائنہ، خلوت ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو، مہر متعین ہوا ہو یا نہ ہوا ہو، اس لیے کہ وَلِلْمُطَلَّقَاتِ مَتَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ ایک عام حکم ہے۔ اسے خاص کرنا صحیح نہیں ہے[۲]

یہ سب رائیں ایک سی ہیں۔ تفصیلات میں تھوڑا بہت اختلاف ہوسکتا ہے۔ جو لوگ مطلقہ کے لیے متعہ کو لازم قرار دینا چاہتے ہیں ممکن ہے وہ اس رائے کو دوسری رایوں کے مقابلہ میں ترجیح دیں لیکن اس میں دو ایک خرابیاں بہت واضح ہیں۔ ایک یہ کہ جس عورت کو خلوت صحیحہ سے پہلے طلاق دی جائے اگر اس کا مہر متعین ہو تو اسے نصف مہر اور متعہ دونوں ملیں گے۔ اور اگر مہر متعین نہ ہو تو اسے صرف متعہ ملے گا۔ یہ ایک طرح کی ناانصافی معلوم ہوتی ہے۔

دوسری یہ کہ متعہ کو ہر مطلقہ کے لیے واجب قرار دینے کا مطلب یہ ہے کہ وہ بھی مہر اور نفقہ کی طرح اس کا ایک لازمی حق ہے اور از روئے قانون وہ اس کا مطالبہ کر سکتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اہل ظاہر اور بعض دوسرے علماء کے نزدیک جیسا کہ اوپر کی تفصیلات سے واضح ہے، متعہ کی نوعیت یہی ہے۔ مشہور مفسر ابن جریر طبری اسی کے قائل ہیں۔ ان کے نزدیک ہر مطلقہ کے لیے مہر ہی کی طرح متعہ بھی واجب ہے۔ شوہر کے لیے اس کا ادا کرنا ضروری ہے۔ اگر وہ متعہ نہ دے تو مہر اور دوسرے قرضوں کی طرح اس کے لیے بھی اس کی قانونی گرفت ہوگی[۳]

۱۔ ابن حزم، المحلی: ۲۴۷
۲۔ حوالہ سابق ص: ۲۴۵
۳۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔ ابن جریر طبری، جامع البیان فی تفسیر القرآن: ۳۰۸/۲-۳۰۹

یہ رائے اس لحاظ سے کم زور معلوم ہوتی ہے کہ اسلامی عدالتوں نے کبھی اس طرح کا فیصلہ نہیں کیا۔ امام شعبی فرماتے ہیں:

والله ما رأيت احدا حبس فيها (فی المتعة) والله لو كانت واجبة لحبس فيها القضاة[۲]

قسم خدا کی میں نے نہیں دیکھا کہ کسی کو متعہ کے نہ دینے پر قید کیا گیا ہو۔ خدا کی قسم اگر یہ واجب ہوتا تو اس کے نہ دینے پر قاضی حضرات قید کی سزا ضرور دیتے۔

اوپر کے صفحات میں ہم نے 'متاع' کے معنی ومفہوم اور اس کی قانونی حیثیت سے تفصیل سے بحث کی ہے اور اس مسئلہ میں مختلف فقہاء کی رائیں بھی پیش کر دی ہیں۔ اس سے یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ نہ تو قرآن و حدیث سے یہ ثابت کیا جاسکتا ہے کہ طلاق کے بعد آدمی پر عورت کی معاشی ذمہ داری برقرار رہتی ہے اور نہ سلف سے خلف تک کسی نے اس رائے کا اظہار کیا ہے۔ یہ ایک ایسا بے بنیاد فکر ہے جس کی تائید کہیں سے نہیں ہوتی۔

مطلقہ کا معاشی مسئلہ

آخر میں اس سوال کو لیجیے کہ طلاق کے بعد عورت کہاں جائے گی، اس کا معاشی بوجھ کون اُٹھائے گا؟ یہ سوال کچھ اس انداز سے کیا جاتا ہے کہ جیسے طلاق ہوتے ہی مسلمان عورت ایسی نازک صورت حال سے دو چار ہو جاتی ہے کہ اس کا کوئی نہ کوئی حل نکالنا ضروری ہو گیا ہے۔ پھر اسے حل کرنے کے لیے طرح طرح کی تجویزیں پیش کی جاتی ہیں اور قرآن مجید سے نئے نئے نکتے نکالے جاتے ہیں، حالاں کہ نکاح اور طلاق کا سلسلہ آج سے نہیں چودہ سو برس سے قائم ہے۔ طلاق بہر حال پہلے بھی ہوتی رہی ہے، نوجوان عورتوں کی بھی اور بڑی عمر والی عورتوں کی بھی۔ ان کے ساتھ مسائل بھی رہے ہیں۔ معقول بات یہ ہے کہ کم از کم یہ معلوم کرنے کی کوشش کی جاتی کہ اسلام کے

نزدیک ان مسائل کا کوئی حل ہے یا نہیں بلکہ یہ توقع رکھنی چاہیے کہ اس نے جہاں زندگی کے اور مسائل میں ہماری راہ نمائی کی ہے اس مسئلہ میں بھی ضرور راہ نمائی کی ہوگی۔ ان سب باتوں سے صرف نظر کرکے یہ خیال کرنا بلکہ یہ باور کرانے کی کوشش کرنا کہ اسلام نے اس کا کوئی علاج ہی نہیں تجویز کیا ہے اور مسلمان مفکرین نے اس طویل عرصہ میں اس پر سوچا ہی نہیں ہے، ناواقفیت اور بے خبری کی ایک نادر مثال ہے۔

اسلام کے نزدیک طلاق کے بعد عورت کا اپنے شوہر سے تعلق بالکل ٹوٹ جاتا ہے اس لیے اس نے اس کے معاشی مسئلہ کو بھی اس کے سابق شوہر سے متعلق نہیں رکھا ہے بلکہ اسے دوسرے طریقوں سے حل کیا ہے۔

۱- یہ ایک بے بنیاد خیال ہے کہ جس عورت کو طلاق ہو جائے، اگر اسے اس کے سابق شوہر سے نان ونفقہ نہ دلوایا جائے تو اس کے گزر بسر کی کوئی صورت ہی نہیں رہ جائے گی۔ اور وہ بھوکوں مر جائے گی۔ اس خیال کے پیچھے عورت کی ہمدردی سے زیادہ، شاید کچھ دوسرے محرکات کام کررہے ہیں۔ ورنہ یہ ایک واقعہ ہے، اور اسے اسلامیات کا ایک معمولی طالب علم بھی جانتا ہے کہ اسلامی قانون کے تحت عورت کے پاس مختلف ذرائع سے دولت آتی ہے۔ اس میں وراثت، مہر اور وصیت وغیرہ شامل ہیں، اس لیے اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ ان ذرائع سے جو دولت حاصل ہو اس سے وہ اطمینان کے ساتھ گزر بسر کرسکے۔

۲- ہم اس سے پہلے واضح کر چکے ہیں کہ اسلامی نقطۂ نظر سے عورت معاشی جدوجہد کے لیے گو مجبور نہیں ہے، لیکن اس میں بھی کوئی قباحت نہیں ہے کہ عورت کا اپنا کوئی جائز ذریعہ معاش ہو۔ وہ ملازمت کرسکتی ہے، زراعت اور تجارت کرسکتی ہے، صنعت اور حرفت میں حصہ لے سکتی ہے۔ غرض یہ کہ اسلامی حدود میں معاشی جدوجہد کا اس پورا حق ہے، اس جدوجہد میں وہ کامیاب ہو تو اپنا بوجھ آسانی سے اُٹھا سکتی ہے بلکہ دوسروں کا تعاون بھی کرسکتی ہے۔

۳- اسلام، انسان کے لیے ازدواجی زندگی کو بہت ضروری سمجھتا ہے۔ اس نے پورے معاشرے کو ہدایت کی ہے کہ ازواجی زندگی گزارنے میں افراد کی مدد کرے۔ حکم ہے:

وَ اَنۡکِحُوا الۡاَیَامٰی مِنۡکُمۡ وَالصّٰلِحِیۡنَ مِنۡ عِبَادِکُمۡ وَ اِمَآئِکُمۡ ؕ	تم میں سے جو بے شادی شدہ ہوں اور تمہارے غلاموں اور لونڈیوں میں سے جو نیک ہوں، ان کے نکاح کر دو۔ (النور:۳۲)

آیت میں 'ایامیٰ' کا لفظ آیا ہے جو 'ایّم' کی جمع ہے۔ یہ غیر شادی شدہ مرد اور عورت دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اس میں وہ عورتیں بھی آتی ہیں جن کی ابھی ازدواجی زندگی ہی نہیں شروع ہوئی ہے، اور وہ عورتیں بھی اس میں شامل ہیں جن کی ازدواجی زندگی طلاق یا بیوگی کی وجہ سے ختم ہوگئی ہے۔ اس میں شک نہیں مختلف اسباب کی بنا پر موجودہ دور میں بیوہ اور مطلقہ کے دوبارہ نکاح کا رجحان مسلمانوں میں کم ہوتا چلا گیا ہے، لیکن اسلام اس رجحان کو بڑھاتا ہے اور اسے فی الواقع بڑھنا ہی چاہیے۔ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ اگر کسی شوہر اور بیوی کے مزاج میں ہم آہنگی نہ ہونے کی وجہ سے وہ الگ ہوگئے ہیں یا ان میں سے ایک کی موت نے دوسرے کی ازدواجی زندگی کو ختم کر دیا ہے تو اس کا فوراً نکاح ہو جانا چاہیے اس لیے کہ بغیر نکاح کے رہنا بہت سی اخلاقی خرابیاں پیدا کرتا ہے۔ اگر اس تعلیم پر عمل ہو تو مطلقہ یا بیوہ کا معاشی مسئلہ خود بہ خود حل ہو جائے گا۔ اس لیے کہ اس کے بعد اس کی معاشی ذمہ داری قانونی طور پر شوہر اٹھانے لگتا ہے۔ چناں چہ اسلامی تاریخ میں جب تک اس پر عمل ہوتا رہا بیوہ اور مطلقہ کا کوئی مسئلہ ہی عملاً موجود نہ تھا۔ یہ اس مسئلہ کا بہترین حل ہے جسے عام ہونا چاہیے۔

۴- مطلقہ (اسی طرح بیوہ) کے پاس کوئی معقول ذریعہ معاش نہ ہو اور اس کا نکاح ثانی بھی نہ ہو تو اسلام نے اس کے خاندان پر اس کی کفالت کی ذمہ داری ڈالی ہے۔ اس سلسلہ میں یہ اصولی بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ اسلامی قانون کی رو سے

عورت کبھی اس بات پر مجبور نہیں ہوتی کہ وہ اپنی معاش کے لیے دوڑ دھوپ کرے[1] فقہ میں کہا گیا ہے مجرد الا نوثۃ عجز[2] (محض عورت ہونا ایک عجز ہے) یعنی اس کے اندر اتنی طاقت نہیں ہوتی کہ وہ اپنا معاشی بوجھ اُٹھا سکے۔ اسی وجہ سے دوسروں کو اس کی یہ ذمہ داری اٹھانی پڑتی ہے۔ شوہر ہر حال میں اس کا نفقہ برداشت کرتا ہے۔ طلاق کے بعد، اگر وہ خود کفیل نہیں ہے اور اس کی اولاد کسب اور محنت کے قابل ہے تو اولاد پر اس کا نان ونفقہ واجب ہو جاتا ہے۔ یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایک بات کی وضاحت کردی جائے۔ وہ یہ کہ فقہا نے لکھا ہے کہ والدین کے نفقہ میں وہ تمام سہولتیں شامل ہیں جو بیوی کے نفقہ میں آتی ہیں۔

ان جمیع ما وجب للمرأۃ وجب للاب والام علی الولد من طعام و شراب و کسوۃ و سکنٰی حتی الخادم[3]

بیوی کے نفقہ میں جو چیزیں واجب ہیں وہ ساری چیزیں ماں باپ کے نفقہ میں لڑکے پر واجب ہوں گی۔ یعنی کھانا، پینا، لباس، مکان، یہاں تک کہ خادم بھی اس میں آتا ہے۔

طلاق کے بعد اگر اس کی دوسری شادی نہ ہو اور اس کے بچے بھی اس کا بوجھ نہ اُٹھا سکتے ہوں تو اس کے باپ پر اس کا نفقہ بالکل اسی طرح لازم آجائے گا جس طرح شادی سے پہلے اس پر لازم تھا۔ فقہ حنفی کی مشہور کتاب ہدایہ کے شارح علامہ ابن الہمام لکھتے ہیں:

فالاناث علیہ نفقتھن الی ان یتزوجن اذا لم یکن لھن مال و لیس لہ ان یؤاجرھن فی عمل

باپ پر لڑکیوں کا نفقہ اگر ان کے پاس مال نہیں ہے تو ان کی شادی تک واجب ہے۔ وہ انھیں کسی کام یا خدمت پر نہیں لگا سکتا

---

[1] اس کی تھوڑی سی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو راقم کی کتاب 'عورت اور اسلام' ص ۳۰،۲۹

[2] رد المحتار علی الدر المختار: ۹۲۵/۲

[3] رد المحتار علی الدر المختار: ۹۳۳/۲

ولا خدمة و ان كان لهن قدرة و اذا طلقت و انقضت عدتها عادت نفقتها على الاب[۲]

چاہے وہ یہ کر ہی کیوں نہ سکتی ہوں[۱] اگر اس کی طلاق ہو جائے تو عدت پوری ہونے کے بعد اس کا نفقہ دوبارہ اس پر واجب ہو جائے گا۔

باپ نہ ہو تو جو بھی اس کا قریبی محرم ہوگا جیسے چچا، بھائی وغیرہ وہ اس کی معاش کا ذمہ دار ہوگا۔ ان میں سے بھی کوئی موجود نہ ہو یا اس کا معاشی بوجھ نہ اُٹھا سکے تو اسلامی ریاست اس کی کفالت کی ذمہ داری قبول کرتی ہے۔ جہاں اسلامی ریاست نہ ہو وہاں مسلم معاشرہ کو یہ بوجھ اُٹھانا چاہیے۔ ہندوستان کا مسلم معاشرہ اس طرح کی عورتوں کا مسئلہ حل کرنا چاہے تو بغیر کسی بڑی دشواری کے حل کر سکتا ہے۔[۳]

جو لوگ اس مسئلہ میں اعتراض پر اعتراض کرتے چلے جاتے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسلام کے قانونِ نفقات سے بالکل ناواقف ہیں۔ یہاں صرف اس کی ایک جھلک دکھائی گئی ہے۔ اس کی تفصیلات جاننے کی انھیں کوشش کرنی چاہیے۔

۱۔ عورت کیا کام کر سکتی ہے اور کن حدود میں، اس پر ہم نے اپنی کتاب 'عورت اسلامی معاشرہ میں' میں تفصیل سے بحث کی ہے۔

۲۔ فتح القدیر: ۳/۳۴۴

۳۔ یہ بات اسلامی نقطۂ نظر سے کہی گئی ہے۔ ہمارا ملک ہندوستان ایک فلاحی ریاست ہے۔ یہ خود اس کی بھی ایک بنیادی ذمہ داری ہے کہ جو افراد معاشی لحاظ سے بے سہارا ہوں ان کو سہارا دے اور ان کا معاشی بوجھ اُٹھائے۔

خلع کی نوعیت

بعض لوگ چاہتے ہیں کہ جس طرح طلاق کا حق مرد کو حاصل ہے اسی طرح کا حق عورت کو بھی حاصل ہو۔ وہ مرد سے علیٰحدگی اختیار کرنا چاہے تو اس کی راہ میں کوئی رُکاوٹ نہ رہے اور جب چاہے اس سے الگ ہو سکے۔ ان کے نزدیک اسلام نے اس معاملہ میں کوئی ناانصافی نہیں کی ہے۔ مرد کو طلاق کا حق دیا ہے تو یہی حق خلع کی شکل میں عورت کو عطا کیا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ عورت اگر شوہر کو مہر واپس کر کے اپنے گھر بیٹھ جائے تو خلع ہو جائے گا۔ گویا خلع عورت کی طرف سے عقد نکاح ختم کرنے کا اعلان ہے، چاہے مرد اس کو قبول کرے یا نہ کرے۔ یہ خلع کی نوعیت سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔ یہاں ہم اس کی فقہی نوعیت واضح کرنے کی کوشش کریں گے۔[1]

خلع مرد کا حق ہے

شرعی نقطۂ نظر سے نکاح کے ذریعہ عورت مرد کی 'ملک نکاح' میں آتی ہے۔ اس ملکیت کو مرد ہی ختم کر سکتا ہے، عورت ختم نہیں کر سکتی۔ خلع کا مطلب صرف یہ ہے کہ عورت سے مال لے کر مرد اس ملکیت سے دست بردار ہو جائے۔ چناں چہ عربی کی مشہور لغت قاموس میں اس کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے۔

---

[1] خلع کے احکام و مسائل کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو راقم کا مضمون 'خلع اور اس کے احکام' مطبوعہ سہ ماہی 'تحقیقات اسلامی' علی گڑھ ج ۱۴، شمارہ ۲ اپریل۔ جون ۹۵ء

ازالة ملک النکاح ببدل منها او من غیرها[1]	معاوضہ لے کر ملک نکاح کا زایل کرنا۔ چاہے یہ معاوضہ عورت خود دے یا کوئی دوسرا دے۔

اب فقہاء کی تشریحات ملاحظہ ہوں۔ علامہ اکمل الدین بابرتی نے اس کی لغوی تعریف کے بعد اس کی شرعی تعریف ان الفاظ میں کی ہے۔

و فی الشریعة عبارة عن اخذ مال من المرأة بازاء ملک النکاح بلفظ الخلع[2]	شریعت میں خلع کا مطلب ہے ملکِ نکاح کے مقابلہ میں عورت سے مال لینا خلع کا لفظ استعمال کرکے۔

علامہ ابن ہمام کہتے ہیں:

ازالة ملک النکاح ببدل بلفظ الخلع[3]	کوئی بدل لے کر ملک نکاح کو خلع کا لفظ استعمال کرکے ختم کر دینا۔

لفظ خلع کے استعمال کے بارے میں کہا گیا ہے۔

مطلق لفظ الخلع محمول علی الطلاق بالعوض[4]	لفظ خلع کا مطلق استعمال ہو تو اسے طلاق بالعوض پر محمول کیا جائے گا۔

---

[1] فیروز آبادی، القاموس المحیط: مادہ خلع

[2] العنایہ علی الہدایہ علی ہامش فتح القدیر: ۱۹۹/۳

[3] فتح القدیر: ۱۹۹/۳۔ اس تعریف پر اعتراض یہ کیا گیا ہے کہ 'بدل' کا لفظ اس میں صحیح نہیں ہے۔ اس لیے کہ بدل کے ذکر کے بغیر بھی مرد اگر عورت سے کہے کہ میں نے تم سے خلع کیا اور عورت اسے قبول کرلے تو خلع ہو جائے گا۔ ہاں اگر مہر کو 'بدل' کہا جائے جو خلع کی وجہ سے ساقط ہو جاتا ہے تو بات دوسری ہے۔ در المختار مع رد المحتار: ۷۶۷/۲، ۷۶۸، لیکن شرح وقایہ میں اسے بدل ہی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ویلزمہ بدلہ ۱۲۳/۲ یعنی عورت پر خلع کا بدل لازم ہے (چاہے وہ مہر ہو یا اس سے کم یا زیادہ قیمت کی کوئی چیز) یہ ایک قانونی بحث ہے۔ اس سے اس مسئلہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا کہ خلع کے ذریعہ عورت خود بہ خود نکاح سے آزاد نہیں ہو جاتی۔

[4] رد المحتار علی الدر المختار: ۷۶۷/۲

یہ فقہ حنفی کی تشریحات ہیں۔ فقہ مالکی میں بھی خلع کو 'الطلاق بالعوض' سے تعبیر کیا گیا ہے[1] یعنی معاوضہ یا بدل لے کر طلاق دینا۔

قاضی بیضاوی شافعی کہتے ہیں:

الاظهرانه طلاق لانه فرقة باختيار الزوج فهو كالطلاق بالعوض[2]	بظاہر یہ طلاق ہے۔ اس لیے کہ اس میں شوہر کی مرضی سے جدائی ہوتی ہے۔ اس طرح یہ طلاق بالعوض ہے۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ خلع طلاق ہی کی ایک شکل ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اسلام نے طلاق کا حق صرف مرد کو دیا ہے۔ وہی خلع بھی کر سکتا ہے اور طلاق بھی دے سکتا ہے۔

خلع کو عورت کے استحصال کے لیے استعمال کی اجازت نہیں ہے

ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ مرد خلع کے اس حق کو عورت کے استحصال کے لیے استعمال کر سکتا ہے۔ وہ عورت کو الگ کرنا چاہے تو اسے طلاق نہیں دے گا تاکہ اسے مہر نہ دینا پڑے بلکہ عورت کو اس قدر تنگ کرے گا کہ وہ اپنا مال دے کر اس سے جان چھڑانے پر مجبور ہو جائے۔ لیکن یہ اعتراض صحیح نہیں ہے۔ اس لیے کہ شریعت کا اصول ہے کہ کوئی بھی شخص ناحق یا زبردستی کسی کا مال اس سے لے نہیں سکتا۔ عورت کا مال بھی اس کی ملکیت ہے۔ وہ خوشی سے اپنا مال شوہر کو دے تو یہ اس کے لیے جائز مال ہوگا اور خلع کے نام پر یا کسی اور نام پر اس کی مرضی کے بغیر، زور زبردستی سے جو مال وہ اس سے حاصل کرے گا وہ ناجائز ہوگا۔ علامہ ابن جریر طبری فرماتے ہیں۔

ان اخذ الزوج من امرأته مالا على	شوہر کا اپنی بیوی سے زبردستی یا اسے تکلیف

---

[1] احمد الدردیر، الشرح الصغیر علی اقرب المسالک: ۵۱۸/۲

[2] انوار التنزیل و اسرار التاویل تفسیر سورہ بقرہ ص ۱۱۱

وجه الاكراه لها والاضرار بها حتى تعطيه شيئا من مالها على فراقها حرام ولو كان ذلك حبة فضة فصاعدا[1]	پہنچانے کے لیے مال لینا تاکہ وہ اپنا کچھ مال دے کر اس سے علیحدگی حاصل کرلے، حرام ہے، چاہے وہ جَو کے ایک دانہ کے برابر چاندی ہو یا اس سے بڑی رقم۔

بلکہ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر مرد خلع کے لیے غلط طریقے سے عورت سے رقم لینے کی کوشش کرے تو اپنی طاقت کی حد تک اسے بچنا چاہیے۔ ورنہ وہ گناہ گار ہوگی[2]

علامہ رشید رضا مصری لکھتے ہیں:

لا يجوز للرجل ان ياخذ منها شيئا الا برضاها من غير ايذاء منه ولا مضارة[3]	مرد کے لیے عورت سے کوئی چیز لینا اسی وقت جائز ہے جب کہ وہ خوشی سے دے اور اس کے لیے اس نے اسے کوئی تکلیف یا نقصان نہ پہنچایا ہو۔

اب اس مسئلہ میں فقہاء کی تصریحات ملاحظہ ہوں۔

فقہ حنفی میں کہا گیا ہے کہ مرد اگر عورت کو خلع پر مجبور کرے تو طلاق تو ہوجائے گی، لیکن مال اسے نہیں ملے گا۔ اس لیے کہ مال کا لین دین باہمی رضا مندی سے ہوتا ہے۔ جبر سے نہیں ہوتا۔ چناں چہ درمختار میں ہے۔

اكرهها الزوج عليه تطلق بلا مال لان الرضا شرط للزوم المال و سقوطه[4]	شوہر اگر عورت کو خلع پر مجبور کرے تو مال کے بغیر طلاق ہو جائے گی۔ عورت پر مال کے واجب ہونے یا اس کے مہر کے ساقط ہونے کے لیے اس کی رضا مندی شرط ہے۔

---

۱ ابن جریر طبری، تفسیر: ۵۸۱/۴-۵۸۲

۲ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ابن جریر طبری، تفسیر: ۵۶۶/۴-۵۶۷

۳ تفسیر المنار ۳۸۹/۲

۴ درالمختار مع ردالمحتار: ۷۲۲/۲

یہی بات فقہ مالکی میں بھی کہی گئی ہے کہ اگر عورت خلع حاصل کرنے کے بعد یہ دعویٰ کرے کہ اس نے اس وجہ سے خلع حاصل کیا تھا کہ وہ اسے تنگ کر رہا تھا اور اسے ایسی تکلیف پہنچ رہی تھی جس میں طلاق کا جواز پیدا ہو جاتا ہے تو وہ اپنا مال واپس لے سکتی ہے، بشرطیکہ وہ اپنے اس دعویٰ پر شہادت فراہم کردے۔ شہادت کے لیے لوگوں کا یہ کہنا کافی ہے کہ وہ مستقل یہ سنتے تھے کہ وہ اسے پریشان کرتا ہے۔ اگر عینی شہادت ہو تو دو مرد گواہ ہوں یا عورت قسم کھائے اور ایک مرد یا دو عورتیں گواہی دیں۔ عینی شہادت کے لیے ایک مرتبہ کا مشاہدہ بھی کافی ہے، بلکہ یہاں تک کہا گیا ہے کہ اگر مرد اس شرط پر خلع کرے کہ عورت کو جو تکلیف وہ دے رہا تھا اس کا ثبوت نہیں دے گی تب بھی وہ خلع کے بعد اس کا ثبوت فراہم کرسکتی ہے۔ بہرحال خلع میں طلاق بائن ہوگی[۱]

امام شافعی اور امام احمد وغیرہ اس خلع ہی کو باطل کہتے ہیں۔ علامہ ابن قدامہ حنبلی لکھتے ہیں کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو خلع پر مجبور کرنے کے لیے تنگ کرے، مار پیٹ کرے، نفقہ اور شب باشی وغیرہ کے حقوق نہ ادا کرے اور عورت مجبور ہو کر خلع حاصل کرلے تو خلع باطل ہوگا اور شوہر کو معاوضہ واپس کرنا ہوگا۔ یہی امام شافعیؒ، اسحٰق بن راہویہ وغیرہ کا بھی مسلک ہے[۲]

اسلام نے خلع کا طریقہ اس لیے رکھا ہے کہ اگر مرد کی طرف سے زیادتی ہو یا عورت اسے ناپسند کرتی ہو تو وہ اسے معاوضہ دے کر قید نکاح سے آزادی حاصل کرسکے۔ خلع اس لیے نہیں ہے کہ مرد عورت کو اپنے ظلم و ستم کا نشانہ بنائے، جہاں ایسی صورت ہو وہ قانونی چارہ جوئی کرسکتی ہے۔ اسلامی قانون اس کی مدد کرے گا۔

خلع کا حق حکومت کو نہیں دیا جاسکتا

ایک رائے یہ ظاہر کی جاتی ہے کہ خلع کا حق حکومت کے ہاتھ میں ہونا چاہیے۔

---

۱ الشرح الصغیر: ۲/۵۰۳

۲ المغنی: ۷/۵۴-۵۵

خلع کے معقول اسباب ہوں تو خلع کرا دے اور ان اسباب سے مطمئن نہ ہو تو خلع نہ کرائے۔ سلف میں بھی یہ رائے پائی جاتی تھی۔ چناں چہ حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں۔'لایجوز الخلع دون السلطان' مطلب یہ کہ خلع حاکم وقت ہی کرسکتا ہے۔ اس کے بغیر یہ جائز نہیں ہے۔ محمد بن سیرینؒ نے بھی اسے سلف سے نقل کیا ہے۔ بعد میں ابوعبید نے اسی رائے کو اختیار کیا ہے۔ ان حضرات کی دلیل یہ ہے کہ قرآن نے فرمایا:

فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيمَا افْتَدَتْ بِهٖ ؕ (البقرہ:۲۲۹)

اگر تمھیں ڈر ہو کہ وہ دونوں اللہ کے حدود کو قائم نہیں رکھیں گے تو ان دونوں پر اس مال (کے لینے دینے) میں کوئی حرج نہیں ہے جسے دے کر عورت خود کو چھڑا لے

دوسری جگہ ارشاد ہے:

وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَ حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا ۚ (النساء:۳۵)

اگر تمھیں ان کے درمیان اختلاف کا ڈر ہو تو تم شوہر کے لوگوں میں سے ایک حکم اور عورت کے لوگوں میں سے ایک حکم بھیجو۔

اس میں بظاہر خطاب میاں بیوی سے نہیں ہے بلکہ امراء و حکّام سے ہے کہ وہ جب میاں بیوی کے درمیان اختلاف کا یا حدود اللہ کو قائم نہ رکھنے کا اندیشہ محسوس کریں تو صلح صفائی یا خلع کا اقدام کریں[1]

لیکن جمہور کے نزدیک خلع کے لیے حکومت کے فیصلہ کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ قاضی شریح، امام مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل، اسحٰق بن راہویہ اور احناف کی یہی رائے ہے۔

حسن بصریؒ وغیرہ کی رائے کے خلاف حسبِ ذیل دلائل دیے گئے ہیں۔

۱- یہ ایک شاذ رائے ہے۔ بہت بڑی اکثریت اس کے خلاف ہے۔ حضرت

---

[1] فتح الباری:۹/۳۱۹

قتادہؒ کہتے ہیں کہ یہ رائے حضرت حسن بصریؒ نے حضرت معاویہ کے گورنرِ عراق زیاد سے لی ہے۔ حافظ ابن حجرؒ کے بقول زیاد کی یہ حیثیت نہیں ہے کہ اس کی تقلید کی جائے۔

۲- اس رائے کا مطلب یہ ہے کہ خلع اسی وقت صحیح ہوگا جب کہ میاں بیوی کے درمیان اختلاف پایا جائے۔ حالاں کہ یہ ضروری نہیں ہے۔ اس لیے کہ حضرت ثابت بن قیسؓ کی بیوی انھیں سخت ناپسند کرتی تھیں، اور اسی ناپسندیدگی کی وجہ سے ان سے علیٰحدگی اختیار کرنا چاہتی تھیں۔ رسول اللہ ﷺ سے اس کا ذکر کیا تو آپؐ نے ان سے فرمایا کہ ثابت بن قیسؓ نے مہر میں جو باغ دیا ہے اسے وہ انھیں واپس کردیں اور ثابت بن قیس سے کہا کہ وہ اپنا باغ لے کر انھیں طلاق دے دیں۔ آپؐ نے ان سے یہ نہیں دریافت فرمایا کہ خود ان کو بیوی سے کوئی اختلاف ہے یا نہیں؟[1]

۳- طلاق کی طرح خلع بھی مرد کا حق ہے۔ جس طرح حاکم کی اجازت کے بغیر مرد طلاق دے سکتا ہے اسی طرح خلع بھی کرسکتا ہے۔ جو حق اللہ تعالیٰ نے اسے دیا ہے اسے اس سے چھین کر کسی دوسرے ادارے کو دینا صحیح نہیں ہے[2]

۴- خلع میں مرد عورت سے معاوضہ لیتا ہے۔ معاوضہ اور بیع میں حاکم کی اجازت کی ضرورت نہیں ہوتی[3]

جمہور کے مسلک کی تائید حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے عمل سے بھی ہوتی ہے۔ امام بخاری فرماتے ہیں۔ اجاز عمر الخلع دون السلطان[4]۔ حضرت عمرؓ نے حاکم کے بغیر بھی خلع کو جائز قرار دیا۔

---

[1] اس واقعہ کی تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو، بخاری، کتاب الطلاق، باب الخلع وکیف الطلاق فیہ۔ نیز ملاحظہ ہو ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ، ابواب الطلاق

[2] فتح الباری: ۳۱۹/۹

[3] المغنی: ۵۲/۷

[4] بخاری، کتاب الطلاق، باب الخلع

اس کی تفصیل عبد اللہ بن شہاب خولانی کی روایت میں ملتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کے دور میں ایک شخص نے اپنی بیوی سے خلع کیا تو حضرت عمرؓ نے اسے جائز قرار دیا۔[1]

ربیع بنت معوذ اور ان کے چچا حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کی خدمت میں پہنچے۔ ربیع نے ان سے کہا کہ حضرت عثمانؓ کے دور میں انھوں نے اپنے شوہر سے خلع حاصل کیا۔ حضرت عثمانؓ کو اس کا علم ہوا تو انھوں نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ نے (بھی اسے غلط نہیں قرار دیا۔ اور) فرمایا کہ مختلعہ کی عدت وہی ہے جو مطلقہ کی ہے۔[2]

عروہ بن زبیر کہتے ہیں کہ ایک شخص نے حضرت عثمانؓ کے دور میں اپنی بیوی سے خلع کیا تو انھوں نے اسے جائز قرار دیا۔[3]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خلع عورت اور مرد کے درمیان کا معاملہ ہے۔ اس میں حکومت کا دخل دینا یا اسے دخیل بنانا صحیح نہیں ہے۔

---

۱ فتح الباری: ۹/۳۱۹

۲ مؤطا، ابواب الطلاق، طلاق المختلعہ

۳ بیہقی، السنن الکبریٰ: ۷/۳۱۶

عورت کا حقِ وراثت

اسلام سے قبل عرب کے معاشرہ میں عورت کا وراثت میں کوئی حق نہیں تھا۔ دلیل یہ تھی کہ عورت کم زور ہے، نہ معاشی دوڑ دھوپ کرسکتی ہے، نہ اپنا اور خاندان کا دفاع اس کے بس میں ہے اور نہ مالِ غنیمت اس کے ذریعہ حاصل ہوسکتا ہے۔ لہٰذا وہ خاندان کی دولت کی وارث نہیں ہوسکتی۔ اسی طرح کم سن لڑکے بھی وراثت سے محروم رکھے جاتے تھے۔ صرف بالغ مرد جو دشمن کا مقابلہ کرسکیں وراثت میں حصہ پاتے تھے۔[1]

وراثت میں مرد اور عورت دونوں کا حق ہے

عرب کا معاشرہ ہی نہیں دنیا کے سب ہی معاشروں نے اسی قسم کے دلائل کی بنیاد پر عورت کو وراثت سے محروم کر رکھا تھا۔ یہ نرینہ اولاد کا اور اس میں بھی بڑی اولاد کا حق سمجھا جاتا تھا۔ اسلام نے اس ظلم کے خلاف آواز اٹھائی اور اعلان کیا کہ وراثت میں جس طرح مردوں کا حق ہے اسی طرح عورتوں کا بھی حق ہے:

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ كَثُرَ ط

مردوں کا بھی اس مال میں حصہ ہے جو ماں باپ اور رشتہ داروں نے چھوڑا ہے اور عورتوں کا بھی اس مال میں حصہ ہے جو ماں باپ اور رشتہ داروں نے چھوڑا ہے متعین حصہ۔

---

[1] تفسیر ابن جریر: ۴/۱۶۳، ۱۶۴۔ اس موضوع پر مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو راقم کا مقالہ ''اسلام کا قانونِ وراثت'' مطبوعہ ''برہان'' دہلی فروری ۱۹۷۶

نَصِيبًا مَّفْرُوضًا ﴿ (النساء:۷) حصہ۔ چاہے مال تھوڑا ہو یا زیادہ۔

اس اصولی ہدایت کے ساتھ قرآن مجید نے وراثت میں عورت اور مرد کے حقوق بھی متعین کر دیے ہیں۔ بعض تفصیلات حدیث اور فقہ میں ملتی ہیں۔ اس پر اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ اس میں عورت اور مرد کے ساتھ مساوات نہیں برتی گئی ہے اور مرد کا حق عورت کے حق سے زیادہ رکھا گیا ہے، لیکن یہ ایک بے بنیاد اعتراض ہے جو اسلام کے قانونِ وراثت اور اس کی حکمت اور معنویت کو نہ سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ جب تک اس قانون کی تفصیلات اور اس کی حکمتیں سامنے نہ ہوں اسے پوری طرح سمجھا نہیں جاسکتا، بلکہ اس سے طرح طرح کی غلط فہمیاں پیدا ہوسکتی ہیں۔ یہاں پہلے ہم قانونِ وراثت کی تھوڑی سی تفصیل پیش کریں گے۔ اس کے بعد اس کی حکمت واضح کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

لڑکے اور لڑکی کا حق

اسلام نے وراثت کو خاندان میں محدود رکھا ہے اور افرادِ خاندان کے درجہ بدرجہ حقوق متعین کردیے ہیں اس میں پہلا اور سب سے بڑا حق اولاد کا ہے۔ ارشاد فرمایا:

يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ ﴿ (النساء:۱۱)

اللہ تعالیٰ تمھیں تمھاری اولاد کے حق میں ہدایت کرتا ہے کہ ایک مرد کا حصہ دو عورتوں کے حصہ کے برابر ہے[1]

اس سے حسبِ ذیل باتیں معلوم ہوئیں:

۱- اولاد میں لڑکے اور لڑکیاں دونوں شامل ہیں۔ وراثت صرف لڑکوں کا حق

---

[1] فرمایا دو لڑکیوں کے حصے کے برابر ایک لڑکے کا حصہ ہے، یہ نہیں فرمایا کہ ایک لڑکے کے حصہ کے برابر دو لڑکیوں کا حصہ ہے۔ گویا اصلاً لڑکیوں کا حصہ ہے۔ اس کے ذریعہ جاہلیت کے اس تصور کی تردید کی گئی ہے کہ لڑکیاں وراثت کی حق دار نہیں ہیں۔ اور یہ تصور دیا گیا ہے کہ اصل حق دار وہی ہیں البتہ لڑکوں کو بعض وجوہ سے ان سے زیادہ دیا جائے گا یہی تعبیر وراثت کے دیگر احکام کے سلسلے میں بھی اختیار کی گئی ہے۔ تفسیر المنار:۴/۴۰۵

نہیں ہے اس میں لڑکیوں کا بھی حصہ ہے۔

۲- ایک لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے حصہ کے برابر ہوگا۔ فرض کیجیے میت کے ایک لڑکا اور ایک لڑکی ہے تو وراثت تین حصوں میں تقسیم ہوگی۔ ایک حصہ (۱/۳) لڑکی کو اور دو حصے (۲/۳) لڑکے کو ملیں گے۔ دو لڑکیاں اور ایک لڑکا ہو تو وراثت کے چار حصے ہوں گے۔ دو حصے (۲/۴) یعنی نصف دو لڑکیوں کو ملیں گے اور دو حصے لڑکے کو۔

ارشاد فرمایا:

فَاِنْ كُنَّ نِسَآءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ (النساء:۱۱)

اگر عورتیں دو سے زیادہ ہوں تو ان کے لیے میت کے ترکہ کا دو ثلث ہے۔

یہ اُس صورت حال کا ذکر ہے جب کہ نرینہ اولاد نہ ہو اور دو سے زائد لڑکیاں موجود ہوں۔ اس صورت میں انھیں دو ثلث (۲/۳) ملے گا۔ اس میں دو سے زیادہ لڑکیوں کی وراثت کا ذکر ہے لیکن یہی حکم دو لڑکیوں کا بھی ہے۔[1]

---

[1] اس کی ایک دلیل یہ ہے کہ ایک لڑکے کے ساتھ ایک لڑکی ہو تو اسے جیسا کہ ابھی ذکر ہوا، ایک ثلث (۱/۳) ملتا ہے۔ جب ایک لڑکی دوسری لڑکی کے ساتھ ہو تو فطری بات ہے اس کا حصہ اس سے کم نہیں ہونا چاہیے۔

اس کی دوسری دلیل یہ ہے کہ قرآن مجید نے صراحت کی ہے کہ میت کے اولاد یا بھائی نہ ہوں اور دو بہنیں ہوں تو وہ دو ثلث (۲/۳) کی حق دار ہوں گی (النساء:۱۷۶) جب دو بہنیں دو ثلث کی حق دار ہیں تو دو لڑکیاں بدرجہ اولیٰ اس کی حق دار ہوں گی۔

تیسری دلیل رسول اللہ ﷺ کا فیصلہ ہے۔ روایات میں آتا ہے کہ حضرت سعد بن ربیعؓ کی دو لڑکیاں تھیں، جنگِ احد میں ان کی شہادت کے بعد ان کے بھائی نے ان کے پورے مال پر قبضہ کرلیا اور ان لڑکیوں کو محروم کر دیا آپ نے ان سے دو لڑکیوں کو دو ثلث (۲/۳) دلوایا (ترمذی، ابواب الفرائض، باب ما جاء فی میراث البنات۔ ابو داؤد، کتاب الفرائض، باب ماجاء فی میراث الصلب)

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ جب دو لڑکیوں کا حصہ دو ثلث ہے تو قرآن مجید نے 'فوق اثنتین' (دو سے زیادہ) کے الفاظ کیوں استعمال کیے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ دو لڑکیوں کو اوپر کے قاعدہ کے تحت جب ایک ایک ثلث ملے گا تو یہ خیال ہوسکتا ہے کہ دو سے زیادہ لڑکیوں کو دو ثلث سے زیادہ ملنا چاہیے۔ قرآن مجید نے اس کی تردید کی ہے اور بتایا ہے کہ لڑکیاں دو سے زیادہ ہوں تو بھی انھیں دو ثلث ہی ملے گا۔

اگر نرینہ اولاد نہیں ہے اور صرف ایک لڑکی ہے تو وہ نصف ورثہ کی حق دار ہوگی۔ فرمایا۔

وَاِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ	اور اگر لڑکی ایک ہے تو اسے ترکہ کا نصف ہے۔ (النساء:۱۱)

اس سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ صرف ایک لڑکا ہو تو وہ پورے مال کا وارث ہوگا اس لیے کہ لڑکے کا حصہ لڑکی سے دوگنا ہے۔ جب تنہا ایک لڑکی نصف کی مستحق ہے تو تنہا ایک لڑکے کو کل کا مستحق ہونا ہی چاہیے البتہ ایک سے زائد لڑکے ہوں تو وراثت ان کے درمیان مساوی طور پر تقسیم ہوگی۔ اس لیے کہ ایک بھائی اور دوسرے بھائی کے درمیان فرق کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔

ماں اور باپ کا حق

اولاد کے بعد وراثت میں ماں باپ کا حق ہے۔ قرآن مجید نے ان کے حقِ وراثت کو اس طرح بیان کیا ہے۔

وَلِاَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ اِنْ كَانَ لَهٗ وَلَدٌ ۚ فَاِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلَدٌ وَّ وَرِثَهٗ اَبَوٰهُ فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ ۚ فَاِنْ كَانَ لَهٗ اِخْوَةٌ فَلِاُمِّهِ السُّدُسُ	اور میت کے ماں باپ میں سے ہر ایک کا چھٹا حصہ ہے اس کے ترکہ میں سے اگر میت کے اولاد ہے۔ اگر اولاد نہیں ہے اور اس کے ماں باپ وارث ہو رہے ہیں تو اس کی ماں کا حصہ ایک تہائی ہے۔ اگر اس کے بھائی بہنیں ہیں تو اس کی ماں کا حصہ چھٹا ہوگا۔ (النساء:۱۱)

اس سے حسبِ ذیل اصول نکلتے ہیں:

۱- میت صاحب اولاد ہے، ایک ہی لڑکا یا لڑکی کیوں نہ ہو، تو ماں باپ میں سے ہر ایک کو سدس ($\frac{1}{6}$) ملے گا۔ اولاد ہی کے حکم میں پوتا پوتی اور ان سے نیچے کی

اولاد آتی ہے۔

۲- میت کے کوئی اولاد نہیں ہے تو ماں کا حصہ ایک ثلث ($\frac{1}{3}$) ہوگا اور باقی دو ثلث ($\frac{2}{3}$) کا وارث باپ ہوگا۔

۳- میت کے اولاد تو نہیں ہے لیکن دو یا دو سے زیادہ بھائی بہنیں (کسی بھی قسم کے) ہیں تو پھر ماں کا حصہ سدس ($\frac{1}{6}$) ہو جائے گا۔ باقی سارا مال باپ کو ملے گا، بھائی اور بہنوں کا کوئی حصہ نہ ہوگا۔

اولاد اور والدین کے حقوق بیان کرنے کے بعد فرمایا:

مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ؕ اٰبَآؤُكُمْ وَ اَبْنَآؤُكُمْ ۚ لَا تَدْرُوْنَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا ؕ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ○ (النساء:۱۱)

اس پر عمل اس وصیت کی تعمیل کے بعد ہوگا جو مرنے والے نے کی ہے یا قرض کی ادائیگی کے بعد۔ تمھارے باپ اور تمھارے بیٹے تم نہیں جانتے کہ ان میں سے کون تمھارے لیے زیادہ نافع ہے۔ یہ اللہ کا مقرر کردہ فریضہ ہے۔ بے شک اللہ جاننے والا اور حکمت والا ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ پہلے وصیت کی تعمیل ہوگی اور قرض ادا کیا جائے گا۔ اس کے بعد وراثت وارثوں میں تقسیم ہوگی[1]

---

[1] میت کے ترکہ میں حسب ذیل چار حقوق ہیں۔

۱- میت کی تجہیز و تکفین کا اوسط درجہ کا انتظام

۲- قرض ہو تو اس کی ادائیگی

۳- وصیت ہو تو اس کی تعمیل

۴- باقی ترکہ وارثوں کے درمیان قانون شریعت کے مطابق تقسیم ہوگا۔

آیت میں قرض کا ذکر وصیت کے بعد ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ پہلے وصیت پوری کی جائے گی۔ اس کے بعد مال بچے تو قرض ادا ہوگا بلکہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ وصیت اور قرض دونوں یا ان میں سے جو بھی ہو اسے پورا کرنے کے بعد وراثت تقسیم کی جائے گی۔ قرض دوسرے کا حق ہے جو آدمی =

میاں اور بیوی کا حق

وراثت میں میاں بیوی کے حقوق قرآن مجید نے ان الفاظ میں بیان کیے ہیں:

وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ اَزْوَاجُكُمْ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهُنَّ وَلَدٌ فَاِنْ كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْنَ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّكُمْ وَلَدٌ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوْصُوْنَ بِهَا اَوْ دَيْنٍ
(النساء:۱۲)

تمہارا حصہ نصف ہے تمہاری بیویوں کے ترکہ میں اگر ان کے کوئی اولاد نہ ہو۔ ان کے اولاد ہے تو تمہارا حصہ ربع ہوگا ان کے ترکہ میں۔ اس وصیت کے پورا کرنے کے بعد جو انھوں نے کی ہے یا (ان کے چھوڑے ہوئے) قرض کے ادا کرنے کے بعد۔ عورتوں کا حصہ ربع ہے تمہارے ترکہ میں تمہارے اولاد نہیں ہے۔ اگر تمہارے اولاد ہے تو ان کو تمہارے ترکہ میں سے ثمن ملے گا جو وصیت تم نے کی ہے اس کی تعمیل اور قرض کے ادا کرنے کے بعد۔

اس آیت سے حسبِ ذیل باتیں معلوم ہوئیں:

۱۔ شوہر کو بیوی کے ترکہ میں سے نصف ($\frac{1}{2}$) ملے گا اگر بیوی کے کوئی اولاد (اسی شوہر سے یا سابق شوہر سے) نہ ہو۔ اس پر اجماع ہے کہ اولاد میں پوتا بھی آتا ہے۔

= پر عائد ہوتا ہے۔ زندگی میں جس طرح اس کا ادا کرنا اس کے لیے ضروری تھا اسی طرح مرنے کے بعد اس کے مال میں سے اس کا ادا کرنا ضروری ہے۔ وصیت کرنا اس کے لیے فرض نہیں ہے یہ ایک نفلی عمل ہے۔ ظاہر ہے فرض نفل پر مقدم ہوگا۔ آیت میں وصیت کا ذکر پہلے اس لیے کیا گیا ہے تاکہ اسے مرنے والے کا نفلی عمل سمجھ کر نظر انداز نہ کیا جائے۔ جب میت نے وصیت کی ہے تو اس کی تعمیل ضروری ہے۔ حضرت علیؓ کی ایک روایت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ رسول اللہ صلعم نے قرض کو وصیت پر مقدم رکھا ہے۔
(ترمذی، ابن ماجہ، دارمی)

وصیت کے بارے میں حدیث میں یہ بھی صراحت ہے کہ وہ ایک تہائی مال سے زیادہ نہیں ہوسکتی۔ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے اپنے سارے مال کی وصیت کرنی چاہی تو آپ نے فرمایا الثلث والثلث کثیر (بخاری، مسلم) یعنی تم ایک ثلث ($\frac{1}{3}$) وصیت کر سکتے ہو اور یہ ایک ثلث بھی زیادہ ہے۔

۲- شوہر کو بیوی کے ترکہ سے ربع ($\frac{1}{4}$) ملے گا اگر اس کی کوئی اولاد موجود ہو (چاہے اس شوہر سے ہو یا کسی سابق شوہر سے)

۳- بیوی کو شوہر کے ترکہ سے ربع ($\frac{1}{4}$) ملے گا اگر شوہر کے کوئی اولاد نہ ہو۔

۴- بیوی کو ثمن ($\frac{1}{8}$) ملے گا اگر شوہر کے کوئی اولاد ہو۔ (اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ اولاد اسی بیوی سے ہے یا کسی دوسری بیوی سے)

اخیافی بھائی بہن کا حق

اولاد، ماں باپ اور میاں بیوی ہر حال میں وارث ہوں گے۔ ان کے بعد دوسرے رشتہ داروں کا حق ہے۔ اس میں سب سے پہلے میت کے بھائی بہن آتے ہیں۔ بھائی بہن تین طرح کے ہوتے ہیں۔ عینی، علاتی اور اخیافی[1]۔ ان میں عینی (حقیقی) بھائی بہنوں کا حق سب سے مقدم ہے۔ وہ نہ ہوں تو علاتی بھائی بہن وارث ہوں گے، اخیافی بھائی بہنوں کے حصے متعین ہیں۔ ان کے یہ حصے امت کا اجماع ہے کہ اس آیت میں بیان ہوئے ہیں۔

وَاِنْ كَانَ رَجُلٌ يُّوْرَثُ كَلٰلَةً اَوِ امْرَاَةٌ وَّلَـهٗۤ اَخٌ اَوْ اُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ ۚ فَاِنْ كَانُوْۤا اَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَآءُ فِى الثُّلُثِ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصٰى بِهَاۤ اَوْ دَيْنٍ ۙ غَيْرَ مُضَآرٍّ ۚ وَصِيَّةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَلِيْمٌ ۝ (النساء:۱۲)

اگر کسی ایسے مرد یا عورت کی میراث ہے جس کا باپ یا بیٹا نہیں ہے اور اس کا ایک بھائی (اخیافی) یا ایک بہن (اخیافی) ہے تو ان میں سے ہر ایک کو چھٹا حصہ ملے گا۔ اگر وہ دو سے زیادہ ہوں تو سب ایک ثلث (تہائی) میں شریک ہوں گے۔ جو وصیت کی گئی ہے اس کے پورا کرنے اور قرض کے ادا کرنے کے بعد، کسی کو ضرر پہنچائے بغیر۔ یہ وصیت ہے اللہ کی اور اللہ جاننے والا اور برد بار ہے۔

---

[1] عینی: حقیقی بھائی بہن کو کہا جاتا ہے۔ جو ایک ماں باپ کی اولاد ہوں، علاتی: سوتیلے بھائی بہن کو کہا جاتا ہے۔ جن کا باپ تو ایک ہو لیکن مائیں مختلف ہوں۔ اخیافی: ان بھائی بہنوں کو کہا جاتا ہے جن کی ماں تو ایک ہو لیکن باپ جدا ہوں۔

مطلب یہ ہے کہ اخیافی بھائی ہو یا بہن ان میں سے ہر ایک سدس ($\frac{1}{6}$) کا حق دار ہوگا۔ اگر وہ دو سے زیادہ ہوں تو ایک ثلث ($\frac{1}{3}$) میں سب کے سب برابر کے شریک ہوں گے۔ اس میں بھائی اور بہن کے حصے میں کوئی فرق نہیں ہے۔

عینی اور علاتی بھائی بہن کا حق

عینی اور علاتی بھائی اور بہنوں کے حقوق ان الفاظ میں بیان ہوئے ہیں:

اِنِ امْرُؤٌا هَلَكَ لَيْسَ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَهٗۤ اُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَۚ وَهُوَ يَرِثُهَاۤ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهَا وَلَدٌ ؕ فَاِنْ كَانَتَا اثْنَتَيْنِ فَلَهُمَا الثُّلُثٰنِ مِمَّا تَرَكَ ؕ وَاِنْ كَانُوْۤا اِخْوَةً رِّجَالًا وَّ نِسَآءً فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ ؕ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اَنْ تَضِلُّوْا ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِيْمٌ ○ (النساء:۱۷۶)

اگر کوئی شخص انتقال کر جائے۔ اس کے کوئی اولاد نہ ہو (باپ بھی نہ ہو) اس کے ایک بہن ہوتو اس کا حصہ میت کے ترکہ میں سے نصف ہوگا، اور وہ شخص اپنی بہن کا وارث ہوگا اگر بہن کے کوئی اولاد نہ ہو۔ اگر بہنیں دو ہوں تو ان کا حصہ بھائی کے ترکہ میں سے دو ثلث ہوگا اور اگر کئی بھائی اور بہنیں ہوں تو بھائی کا حصہ دو بہنوں کے حصہ کے برابر ہوگا۔ اللہ تعالیٰ تمھیں یہ باتیں کھول کر بیان کر رہا ہے تاکہ تم گم راہی میں نہ پڑو۔ اللہ ہر چیز کو جانتا ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میت کے لڑکا (یا پوتا اور اس کے نیچے نرینہ اولاد) ہو۔ یا اوپر کے سلسلہ میں باپ، دادا وغیرہ ہوں تو بہنوں اور بھائیوں کا وراثت میں کوئی حصہ نہ ہوگا، اگر وہ نہ ہوں تو ان کے درمیان وراثت حسبِ ذیل طریقہ سے تقسیم ہوگی۔

۱- صرف ایک بہن ہوتو اس کا حصہ نصف ہوگا۔

۲- صرف ایک بھائی ہوتو وہ بہن کی پوری وراثت کا حق دار ہوگا۔

۳- دو یا دو سے زیادہ بہنیں ہوں اور بھائی نہ ہوتو انھیں دو ثلث ($\frac{2}{3}$) ملے گا۔

اگر میت کے صرف لڑکیاں ہیں تو ان کا متعین حصہ (ایک ہوتو نصف ($\frac{1}{2}$) اور ایک سے زیادہ ہوتو دو ثلث ($\frac{2}{3}$) دینے کے بعد جو مال بچے گا وہ بھائیوں اور بہنوں

کے درمیان اوپر کے قاعدہ (ایک مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر) کے مطابق تقسیم ہوگا۔ اگر لڑکیوں کے ساتھ ساتھ بہنیں ہوں تو لڑکیوں کا حصہ دینے کے بعد جو بچ جائے وہ بہنوں کا ہوگا۔

یہ وراثت کے وہ موٹے موٹے احکام ہیں جو قرآن مجید میں بیان ہوئے ہیں ان کی تفصیلات حدیث اور فقہ کی کتابوں میں موجود ہیں۔ یہاں ان سے بحث نہیں کی گئی ہے۔

وراثت کی بنیادیں

نسبی رشتے اور ازدواجی تعلق اصل ہیں

اسلام کا یہ قانون وراثت جن بنیادوں پر قائم ہے اب ہم ان کی تھوڑی سی وضاحت کریں گے۔ اس سے اس کی حکمت کے بعض گوشے سامنے آسکیں گے۔ وراثت کی ساری تقسیم افرادِ خاندان کے مابین ہوتی ہے۔ اس میں نسبی رشتوں اور نکاح کو بنیاد بنایا گیا ہے[1] خاندان ایک مستقل اکائی ہے، جس کے افراد کو نسبی رشتہ اور خونی تعلق باہم جوڑے رکھتا ہے۔ ان کے درمیان محبت، ہمدردی اور تعاون کا فطری جذبہ موجود ہوتا ہے، وہ عملاً ایک دوسرے کے نفع و نقصان میں شریک ہوتے ہیں۔ ان کی ترقی میں مدد دیتے اور مشکلات میں کام آتے ہیں۔ اسی وجہ سے خاندان سے انسان کی وابستگی بڑی گہری ہوتی ہے۔ وہ اس کی فلاح و بہبود کو دوسرے بہت سے فائدوں پر مقدم رکھتا ہے، اس کی معاشی تگ و دو بھی بڑی حد تک اسی کے لیے ہوتی ہے اس لیے فطری طور پر وہ

---

[1] وراثت کی ایک بنیاد 'ولاء' بھی ہے، حدیث میں آتا ہے۔ الولاء لمن اعتق (بخاری، کتاب البیوع، باب الشریٰ والبیع مع النساء۔ مسلم کتاب العتق، باب ان الولاء لمن اعتق) اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص کسی غلام کو آزاد کرے اور اس کا کوئی وارث نہ ہو تو آزاد کرنے والا اس کا وارث ہوگا۔ یہاں اس کی تفصیل کی ضرورت نہیں محسوس ہو رہی ہے۔

خاندان کو اپنی دولت میں شریک اور اس کا جائز حق دار تصور کرتا ہے۔

میاں بیوی کے درمیان بالعموم خونی رشتہ تو نہیں ہوتا لیکن ان کا تعلق اتنا قریبی ہوتا ہے اور وہ ایک دوسرے کے کاموں میں اس طرح شریک ہوتے ہیں کہ وہ خاندان ہی کے افراد شمار ہوتے ہیں۔ وراثت میں ان کے حق سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

وہ رشتہ دار جو کبھی محروم نہیں ہوتے

خاندان کے جن افراد کا میت سے براہِ راست تعلق ہوتا ہے ان کو وراثت میں لازماً ان کا حصہ ملتا ہے۔ اور وہ کسی حال میں اس سے محروم نہیں ہوتے، چاہے وہ مرد ہوں یا عورتیں۔ اس میں حسب ذیل افراد ہوتے ہیں۔

(الف) میت کی اولاد (اس میں لڑکے اور لڑکیاں دونوں شامل ہیں)۔

(ب) میت کے ماں باپ۔

(ج) میاں اور بیوی میں سے جو بھی موجود ہو۔

ان میں سے 'اصحاب الفرائض' کو ان کے متعین حصے ملیں گے۔ باقی مال کے وارث عصبہ ہوں گے۔[1]

خاندان کے دوسرے افراد کے مقابلہ میں ان کی ترجیح کا سبب بالکل واضح ہے۔ انسان نفسیاتی طور پر بھی ان کو سب سے زیادہ قریب تصور کرتا ہے اور عملاً بھی وہی

---

[1] علم وراثت میں 'اصحاب الفرائض' ان افراد کو کہا جاتا ہے جن کے حصے وراثت میں شریعت نے متعین کر دیے ہیں۔ ان حصوں کے نکالنے کے بعد جو افراد باقی مال کے وارث ہوتے ہیں انھیں 'عصبہ' کہا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر میت کے بیوی، ماں باپ لڑکا اور لڑکی ہیں تو ان میں ماں باپ اور بیوی 'اصحاب الفرائض' ہیں اس لیے کہ ان کے حصے متعین ہیں۔ باقی مال کے وارث لڑکا اور لڑکی ہوں گے اس لیے وہ 'عصبہ' کہلائیں گے۔ لڑکے کے بغیر صرف لڑکی ہوتی تو اس کا شمار بھی اصحاب الفرائض میں ہوتا کیوں کہ اس صورت میں اس کا حصہ (نصف) متعین ہے۔ اس صورت میں باپ عصبہ ہوگا اس لیے کہ وہ اپنے متعین حصہ (سدس) کے علاوہ باقی مال کا بھی وارث ہوگا۔

اس کے قریب ہوتے ہیں۔ زندگی بھر براہِ راست اور بلا واسطہ ان ہی سے اس کا تعلق ہوتا ہے۔ جو دولت اور سرمایہ وہ محنت اور مشقت سے حاصل کرتا ہے اسے ان پر خرچ کر کے وہ ایک طرح کی قلبی مسرت اور سکون محسوس کرتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اس کے مرنے کے بعد بھی وہی اس کی دولت کے وارث ہوں اور ان کے ہوتے ہوئے کوئی دوسرا اس کی دولت پر قبضہ نہ کرے۔ یہ ایک فطری جذبہ ہے۔ اسے غلط نہیں کہا جاسکتا۔ قرآن نے اسی کو قانونی شکل عطا کی ہے۔

اولاد کا حق سب سے زیادہ ہے

خاندان کے ان قریبی افراد میں بھی اس نے اولاد کے حق کو والدین کے حق پر مقدم رکھا ہے۔ اس میں ان کی ضروریات اور معاشی تقاضوں کو سامنے رکھا گیا ہے۔ اولاد اپنے والدین کی جانشین ہوتی ہے۔ وہ ان کے بعد ان کی بہت سی ذمہ داریوں کو اٹھاتی اور ان کے چھوڑے ہوئے منصوبوں کو آگے بڑھاتی ہے۔ اس کے ساتھ خود اس پر نئی نئی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں جن کی تکمیل کے لیے اسے نئے وسائل تلاش کرنے پڑتے ہیں اور حال کی بنیاد پر مستقبل کی تعمیر کرنی ہوتی ہے۔ اس لیے اسے دولت اور سرمایہ کی جتنی ضرورت ہوتی ہے اتنی اس کے والدین کو نہیں ہوتی۔ خود والدین بھی فطری طور پر اپنی دولت اپنی اولاد ہی کے حوالہ کرنا چاہتے ہیں اور کسی دوسرے کو ان پر ترجیح دینے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ ہاں اگر اولاد نہ ہو تو والدین کا حق مقدم ہوگا۔

عورت اور مرد کے درمیان فرق کہاں اور کیوں؟

میت سے عورت اور مرد کا تعلق رشتہ کے لحاظ سے برابر کا ہو تو ایک مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہوگا جیسے لڑکا اور لڑکی یا بھائی اور بہن۔ اس کے پیچھے عورت کی کم تری اور مرد کی برتری کا کوئی تصور نہیں ہے۔ یہ تصور ہوتا تو ہر حال میں عورت کا حصہ کم ہوتا یا وہ بالکل محروم کردی جاتی۔ حالاں کہ ان میں سے کوئی بھی بات نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ

ہے کہ اسلام نے وراثت کو معاشی ذمہ داریوں کے ساتھ جوڑا ہے۔ اسلامی قانون کی رو سے مرد پر ساری معاشی ذمہ داریاں ہیں جب کہ عورت کو ان ذمہ داریوں سے مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے۔ اسے سمجھنے کے لیے مثال کے طور پر لڑکے اور لڑکی کو لیجیے۔ لڑکا اپنے بیوی بچوں کا خرچ برداشت کرتا ہے، ہوسکتا ہے اسے ماں باپ میں سے جو موجود ہو اس کے اخراجات بھی اٹھانے پڑیں۔ ایسے حالات بھی ہوسکتے ہیں جن میں اسے نادار بھائی بہنوں اور دوسرے رشتہ داروں کی کفالت کرنی پڑے۔ اس طرح اس کے پاس آنے والا سرمایہ مسلسل خرچ ہوتا رہتا ہے۔ اس کے برخلاف لڑکی صاحب حیثیت ہے تو اسے زیادہ سے زیادہ اپنے اخراجات برداشت کرنے ہوں گے۔ اپنی ایک ذات کے سوا کسی دوسرے کی معاشی ذمہ داری اس پر نہیں ہے۔ شادی کے بعد تو اس پر اپنی معاشی ذمہ داری بھی باقی نہیں رہتی۔ شوہر پر اس کا نان ونفقہ لازم قرار دیا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دونوں کی ذمہ داریوں کو سامنے رکھا جائے تو نہ لڑکے کے حصہ کو زیادہ کہا جاسکتا ہے اور نہ لڑکی کے حصہ کو کم۔ دونوں میں انتہائی عدل وتوازن قائم کیا گیا ہے۔

اسی طرح شوہر کے مقابلہ میں بیوی کا حصہ نصف ہے۔ اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ وہ معاشی ذمہ داریوں سے آزاد ہے۔ اس کے علاوہ شوہر سے اسے مہر ملتا ہے۔ شادی اور دوسری تقریبات پر اسے جو زیورات یا تحفے تحائف دیے جاتے ہیں وہ سب اس کی ملکیت ہیں۔ شوہر کے انتقال کے بعد بیوی کو اور بیوی کے انتقال کے بعد شوہر کو وراثت میں ان کا حصہ ملتا ہے۔ اب اگر بیوی کے انتقال کے بعد شوہر دوسری شادی کرے تو اسے اس نئی بیوی کا بھی مہر دینا ہوگا اور نفقہ بھی برداشت کرنا ہوگا۔ لیکن شوہر کے انتقال کے بعد بیوی دوسرا نکاح کرے تو اسے دوبارہ مہر ملے گا اور اس کا نفقہ بھی دوسرے شوہر پر واجب ہوگا۔ ان وجوہ سے کیا یہ عین انصاف نہیں ہے کہ وراثت میں بیوی کا حصہ شوہر کے حصہ سے نصف ہو؟ کیا یہ شوہر کے ساتھ ناانصافی نہ ہوگی کہ اس کا حصہ بیوی کے برابر کر دیا جائے؟ یہی بات حافظ ابن کثیرؒ نے ان الفاظ میں کہی ہے۔

جعل للذکر مثل حظ الانثیین و ذٰلک لاحتیاج الرجل الی مؤنة النفقة والکلفة و معاناة التجارة والتکسب و تحمل المشاق فناسب ان یعطی ضعفی ما تاخذہ الانثی[1]

اللہ تعالیٰ نے ایک مرد کا حصہ دو عورتوں کے حصہ کے برابر رکھا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مرد کو نان ونفقہ کا بوجھ اور تکلیف، تجارت اور کسب معاش کی دشواریاں اور اس سلسلہ کی دوسری مشقتیں اٹھانی پڑتی ہیں، اس لیے مناسب یہی ہے کہ عورت جو حصہ پاتی ہے اس سے دوگنا مرد کو دیا جائے۔

علامہ رشید رضا مصری کہتے ہیں۔

والحکمة فی جعل حظ الذکر کحظ الانثیین ھی ان الذکر یحتاج الی الانفاق علی نفسه و علی زوجه فکان له سهمان و اما الانثی فهی تنفق علی نفسها فان تزوجت کانت نفقتها علی زوجها و بهٰذا الاعتبار یکون نصیب الانثٰی من الارث اکثر من نصیب الذکر فی بعض الحالات بالنسبة الی نفقاتهما[2]

ایک مرد کا حصہ دو عورتوں کے حصہ کے برابر رکھنے میں حکمت یہ ہے کہ مرد کو اپنے اوپر بھی اور اپنی بیوی پر بھی خرچ کرنا پڑتا ہے، لہٰذا اس کے دو حصے ٹھہرے۔ عورت صرف اپنی ذات پر خرچ کرتی ہے، اگر شادی ہو جائے تو اس کا اپنا نفقہ بھی اس کے شوہر پر واجب ہو جاتا ہے۔ نان و نفقہ کی ذمہ داریوں ہی کے پہلو سے بعض حالات میں عورت کا حصہ مرد کے حصہ سے زیادہ بھی ہو جاتا ہے۔

اس طرح اسلام نے عورت پر سے معاشی ذمہ داریوں کو ختم کر کے وراثت کی بعض صورتوں میں اس کا حصہ مرد کے حصہ سے نصف رکھا ہے۔ اس پر نہ تو مرد کو

---

[1] تفسیر ابن کثیر: ۱/۴۵۷

[2] تفسیر المنار: ۴/۴۰۶۔ اس بیان میں یہ بات صحیح نہیں ہے کہ عورت کی معاشی ذمہ داریوں کی وجہ سے وراثت میں کبھی اس کا حصہ مرد کے حصہ سے زیادہ ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ میت سے عورت کی قرابت ہے۔ تفصیل آگے آ رہی ہے۔

اعتراض ہوسکتا ہے کہ اس پر ذمہ داریاں کیوں ڈالی گئی ہیں اور نہ عورت یہ شکایت کر سکتی ہے کہ اس کا حصہ کم کیوں رکھا گیا ہے۔ اس کے برخلاف وراثت میں دونوں کا حصہ مساوی ہوتا تو مرد یہ مطالبہ کرنے میں حق بہ جانب ہوتا کہ معاشی ذمہ داریوں میں بھی عورت کو شریک کیا جائے۔ حقوق اور ذمہ داریوں کی یہ تقسیم مرد اور عورت دونوں کی فطرت کے عین مطابق ہے۔ اس سے بہتر تقسیم کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔

حافظ ابن قیم مرد کی مالی ذمہ داریوں کے ساتھ ایک اور پہلو کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں۔ وہ یہ کہ آدمی کو اس کی زندگی میں عورت سے زیادہ مرد سے مادی فائدہ پہنچتا ہے۔ لہٰذا اس کے مرنے کے بعد مرد کا حصہ بھی اس کے مال میں زیادہ ہونا چاہیے۔ فرماتے ہیں:

واما المیراث فحکمة التفصیل فیه ظاهرة فان الذکر احوج الی المال من الانثی لان الرجال قوامون علی النساء والذکر انفع للمیت فی حیاته من الانثی و قد اشار سبحانه تعالیٰ الی ذالک بعد ان فرض الفرائض و تفاوت بین مقادیرها اٰبائکم و ابنائکم لا تدرون ایهم اقرب لکم نفعا و اذا کان الذکر انفع من الانثی و احوج کان احق بالتفصیل[1]

مرد کو میراث کے زیادہ ملنے کی وجہ بالکل واضح ہے۔ اسے عورت کے مقابلہ میں مال کی زیادہ ضرورت ہے کیوں کہ وہ قوام ہے (اسے عورت کے اخراجات اٹھانے پڑتے ہیں) اس کے علاوہ میت کو اس کی زندگی میں مرد سے زیادہ فائدہ پہنچتا ہے۔ اسی حقیقت کی طرف اللہ تعالیٰ نے وراثت کے حقوق متعین کرنے اور ان کی مقدار میں فرق کرنے کے بعد اشارہ فرمایا ہے کہ تم اس بات کو نہیں جانتے کہ تمہارے باپ اور تمہاری اولاد میں سے کون تمہارے لیے زیادہ نفع بخش ہے۔ جب میت کی زندگی میں اسے عورت سے زیادہ مرد سے فائدہ پہنچتا رہتا ہے اور وہ مال کا حاجت مند بھی زیادہ ہے تو وہ اس کا زیادہ مستحق ہے کہ اسے وراثت میں ترجیح دی جائے۔

---

[1] اعلام الموقعین: ۱۱۳/۲

بعض حالات میں دونوں میں فرق نہ ہونے کی وجہ

جہاں مرد کی معاشی ذمہ داریاں کم ہو جاتی ہیں وہاں اسلام نے عورت اور مرد کے درمیان فرق نہیں کیا ہے۔ چناں چہ میت کی اولاد ہو تو اس نے ماں اور باپ دونوں کا حصہ وراثت میں ایک ($\frac{1}{6}$) رکھا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اولاد کا حق مقدم ہے، دوسری وجہ یہ ہے کہ جس شخص کی اولاد بھی صاحب اولاد ہو وہاں اس کی ذمہ داریاں بڑی حد تک کم ہو جاتی یا ختم ہو جاتی ہیں۔ اس کی حیثیت بالعموم اپنے پوتے پوتیوں کے سرپرست کی ہوتی ہے۔ ہاں اگر میت کے اولاد نہیں ہے، جو اس کی وراثت کی اوّلین مستحق ہے، اور میت کا باپ صاحب اولاد ہے، جو میت کے بھائی بہن ہوں گے، تو باپ کا حق ماں سے زیادہ ہوگا، اس لیے کہ اس صورت میں باپ کی ذمہ داریاں بھی زیادہ ہوسکتی ہیں۔

قریب کے رشتہ داروں کا حق زیادہ ہے

اسلام نے وراثت کی تقسیم اس اصول کی بنیاد پر کی ہے کہ خونی رشتوں میں جو رشتہ میت سے جتنا قریب ہوگا اتنا ہی اس کا حق مقدم ہوگا[1]۔ دور کے رشتہ دار اسی وقت مستحق ہوں گے جب کہ قریب کے رشتہ دار موجود نہ ہوں یا قریب کے رشتہ داروں کو ان کا متعین حصہ ملنے کے بعد ترکہ بچ جائے۔ اس اصول کے تحت جو عورت میت سے رشتہ میں قریب ہے اس کا حق اس مرد سے زیادہ ہوسکتا ہے جو میت سے رشتہ میں دور ہے۔ فرض کیجیے میت کے صرف ایک لڑکی اور ایک بھائی ہے تو میت کا ترکہ دونوں میں مساوی تقسیم ہو جائے گا اگر ایک لڑکی اور دو بھائی ہیں تو لڑکی نصف ($\frac{1}{2}$) کی حق دار ہوگی اور

---

[1] اگر کوئی مرد میت سے رشتہ میں قریب ہے تو دور کے رشتہ دار وراثت سے محروم ہو جائیں گے۔ اسی اصول کی بنا پر اولاد موجود ہو تو پوتے اور پوتیوں کا کوئی حصہ نہ ہوگا یا باپ زندہ ہے تو میت کے بھائی اور بہنیں (یعنی باپ کی اولاد) وراثت کے حق دار نہ ہوں گے۔

دونوں بھائیوں کو نصف (۱/۲) ملے گا۔ اگر دو یا دو سے زائد لڑکیاں ہوں تو ان کا حصہ دو ثلث (۲/۳) ہوگا اور ایک یا ایک سے زائد بھائیوں کو صرف ایک ثلث (۱/۳) ملے گا۔

ان تفصیلات سے اس الزام کی صاف تردید ہوتی ہے کہ وراثت کے معاملہ میں عورت کے ساتھ عدل و انصاف نہیں ہوا ہے۔ اس میں نہ تو مرد کے ساتھ جانب داری برتی گئی ہے اور نہ عورت کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔ اسلام نے ایک طرف میت سے عورت کے رشتہ کو اہمیت دی ہے تو دوسری طرف مرد کی معاشی ذمہ داریوں کو سامنے رکھا ہے۔ اس بنیاد پر وراثت میں عورت کا حصہ کہیں کم ہے تو کہیں زیادہ اور بعض حالات میں عورت اور مرد دونوں کے حصے مساوی بھی رکھے گئے ہیں۔ یہ قرابت داری اور معاشی ذمہ داریوں کے درمیان بے مثال توازن ہے۔ یہ توازن اسلامی شریعت کی وہ نمایاں خصوصیت ہے جو اسے دوسرے مذاہب اور نظریات سے ممتاز کرتی ہے۔

عورت کا قصاص

قصاص جان کا بھی ہوتا ہے اور جراحات اور زخموں کا بھی۔ جان کا قصاص یہ ہے کہ جو شخص ناحق کسی کو قتل کرے اس کے بدلہ میں اسے قتل کر دیا جائے۔ زخموں اور جراحات کا قصاص یہ ہے کہ اگر کوئی کسی کو زخمی کر دے یا اس کے کسی عضو کو نقصان پہنچائے تو اس کے مساوی اس سے بدلہ لیا جائے۔ قصاص کا یہ قانون انسان کے جسم و جان کی حفاظت کے لیے ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ قانون عورت اور مرد دونوں کے لیے ایک ہے یا اسلام نے اس معاملہ میں ان کے درمیان کہیں کوئی فرق بھی کیا ہے؟ یہ سوال ہماری فقہ میں بہت پہلے سے زیر بحث رہا ہے اور اب حال میں جب سے عورت کے حقوق پر ہر طرف بحث چھڑی ہے یہ سوال پھر سے اُبھر آیا ہے۔ یہاں اس بات کی کوشش کی جائے گی کہ اس مسئلہ کی ضروری تفصیلات پیش کر کے راجح مسلک کی نشان دہی کی جائے۔

عورت کی جان کا قصاص مرد سے

قرآن مجید نے قصاص کا حکم ان الفاظ میں دیا ہے۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلَى (البقرہ:۱۷۸)

اے ایمان والو! تم پر مقتولین میں قصاص (برابر کا بدلہ) فرض کر دیا گیا ہے۔

اس کی حکمت یہ بیان ہوئی ہے۔

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰأُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ○ (البقرہ:۱۷۹)

اے عقل مندو! تمہارے لیے قانون قصاص میں زندگی ہے تاکہ تم اپنی جان جانے کے ڈر سے دوسروں کے قتل سے بچے رہو۔

توریت کے حوالے سے کہا گیا ہے۔

وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيْهَآ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ (المائدہ:۴۵)

ہم نے توریت میں یہودیوں پر یہ حکم فرض کر دیا تھا کہ جان کے بدلہ جان لی جائے گی۔

اس قانون کے تحت مرد عورت کو قتل کردے تو مرد سے قصاص لیا جائے گا اور عورت مرد کو قتل کردے تو عورت سے قصاص لیا جائے گا۔ احادیث سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ ایک حدیث میں صراحت کے ساتھ کہا گیا ہے۔

الرجل يقتل بالمرأة اذا قتلها[1]

مرد اگر عورت کو قتل کردے تو اس کے بدلہ میں اسے قتل کیا جائے گا۔

اس کی تائید اور روایتوں سے بھی ہوتی ہے۔ صحاح ستہ کی روایت ہے کہ ایک یہودی نے ایک انصاری لڑکی کا زیور چھیننے کے لیے اس کا سر کچل کر ایک گڑھے میں پھینک دیا۔ جان کنی کی حالت میں لڑکی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں لائی گئی جن لوگوں کے بارے میں قتل کا شبہ تھا ان میں سے ایک ایک کا نام لے کر اس سے پوچھا گیا تو اس نے سر کے اشارے سے انکار کیا، لیکن جب اس یہودی کا نام لیا گیا جس نے قتل کیا تھا تو اس نے اشارے ہی سے اثبات میں جواب دیا۔ اس کے بعد اس یہودی سے دریافت کیا گیا تو اس نے تھوڑے سے رد و کد کے بعد اپنے جرم کا اعتراف

---

[1] بیہقی، السنن الکبریٰ: ۸/ ۲۸ یہ حدیث ان الفاظ کے ساتھ بھی آئی ہے۔ ان الرجل يقتل بالانثىٰ۔ اس حدیث کی سند پر جرح کی گئی ہے لیکن عام طور پر محدثین نے اسے قبول کیا ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔ التلخيص الحبير: ۲/ ۳۳۶، ۳۳۷

کیا۔ چناں چہ قصاص میں اسے بھی پتھر مار کر ہلاک کر دیا گیا۔[۱]

امام نوویؒ فرماتے ہیں اس حدیث سے بہت سے مسائل نکلتے ہیں۔

منها قتل الرجل بالمرأة و هو اجماع من يعتد به.[۲]

ان میں سے ایک یہ ہے کہ مرد کو عورت کے بدلہ میں قتل کیا جائے گا اس پر قابل لحاظ سب ہی لوگوں کا اجماع ہے۔

ابوداؤد وغیرہ کی ایک لمبی روایت میں آتا ہے:

ان عقل المرأة بين عصبتها من كانوا لا يرثون منها شيئا الا ما فضل عن ورثتها فان قتلت فعقلها بين ورثتها وهم يقتلون قاتلهم.[۳]

عورت کی دیت (اگر وہ کسی ایسے جرم کا ارتکاب کر گزرے تو) اس کے عصبہ پر واجب ہوگی۔ عصبہ سے مراد وہ لوگ ہیں جو اصحاب الفروض کو ان کے متعین حصے دینے کے بعد اس کی ساری وراثت کے حق دار ہوتے ہیں۔ (جیسے بیٹے، پوتے اور بھائی وغیرہ) لیکن اگر اس کا قتل ہوجائے تو اس کی جو دیت ملے گی وہ سب وارثوں کے درمیان تقسیم ہوگی اور وہ (قصاص لینا چاہیں تو) اپنے قاتل کو قتل کرسکیں گے۔

۱؎ بخاری، کتاب الدیات، باب سوال القاتل حتی یقر۔ مسلم، کتاب القسامہ الخ، باب ثبوت القصاص فی القتل الخ۔ ابوداؤد کتاب الدیات، باب یقاد من القاتل۔ ترمذی، ابواب الدیات، باب ماجاء فی من رضخ رأسہ بصخرۃ۔ نسائی کتاب القسامۃ، باب القود من الرجل للمراۃ۔

۲؎ شرح مسلم: ۲/۵۸۔ امام شوکانی فرماتے ہیں کہ اس کی حدیث سے یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ کوئی غیر مسلم، مسلمان عورت کو قتل کر دے تو قصاص میں اسے قتل کر دیا جائے گا۔ لیکن یہ اشکال بہر حال باقی ہے کہ کیا یہی حکم اس وقت بھی ہوگا جب کہ قاتل مسلمان ہو۔ اس لیے کہ شریعت نے غیر مسلم اور مسلم کے قصاص میں فرق کیا ہے۔ مسلمان سے غیر مسلم کا قصاص نہیں لیا جاسکتا۔ نیل الاوطار: ۷/۱۶۲ لیکن جس فرق کی بنیاد پر امام شوکانی نے اشکال ظاہر کیا ہے اس پر سب کا اتفاق نہیں ہے۔ احناف کے نزدیک ایک مسلمان کسی ذمی کو قتل کردے تو قصاص میں اسے بھی قتل کیا جائے گا۔ ہدایہ: ۴/۵۵۹

۳؎ ابوداؤد، کتاب الدیات، باب دیات الاعضاء

وہ اپنے قاتل کو یعنی عورت کے قاتل کو قتل کریں گے۔ چناں چہ نسائی اور ابن ماجہ کی روایت میں قاتلھا (اس کے قاتل) کے الفاظ موجود ہیں[۱] اس سے صاف ظاہر ہے کہ عورت کے قصاص میں مرد کو قتل کیا جائے گا۔ عورت کے قاتل کو ورثاء کا قاتل قرار دینے سے اس کی قانونی حیثیت ظاہر ہوتی ہے۔ گویا وہ صرف ایک عورت کا قاتل نہیں بلکہ اس کے سارے ورثاء کا قاتل ہے۔ انھیں یہ قانونی حق حاصل ہے کہ چاہیں تو اس سے قصاص لیں، یا دیت پر راضی ہو جائیں یا معاف کردیں۔

سید التابعین حضرت سعید بن مسیبؒ فرماتے ہیں:

الرجل يقتل بالمـرأة اذا قتلهـا[۲]	مرد کو عورت کے عوض قتل کیا جائے گا اگر وہ اسے قتل کردے۔

امام بخاری فرماتے ہیں:

قال اهل العلم يقتل الرجل بالمـرأة[۳]	اہل علم نے کہا ہے کہ مرد کو عورت کے قصاص میں قتل کیا جائے گا۔

یہی رائے ائمہ اربعہ، امام ابو حنیفہ، امام مالک، امام شافعی، امام احمد اور عام علمائے امت کی ہے[۴]

علامہ ابن عبدالبر کہتے ہیں کہ اس پر اجماع ہے کہ مرد سے عورت کا اور عورت سے مرد کا قصاص لیا جائے گا۔ صحابہ میں حضرت علیؓ اور تابعین میں حضرت حسن بصریؒ کے بارے میں آتا ہے کہ اگر مرد عورت کو قتل کردے اور اس کے ورثا قصاص میں اسے قتل کرنا چاہیں تو آدھی دیت دے کر قتل کر سکتے ہیں (اس لیے کہ عورت کی دیت نصف

---

۱ نسائی، کتاب القسامۃ، باب کم دیۃ شبہ العمد۔ ابن ماجہ، ابواب الدیات، باب عقل المرأۃ علی عصبتھا الخ

۲ بیہقی، السنن الکبریٰ: ۸/ ۲۸

۳ بخاری، کتاب الدیات، باب القصاص بین الرجال والنساء

۴ ابن قدامہ، المغنی: ۷/ ۶۷۹

ہے) اگر وہ آدھی دیت نہ دیں تو انھیں عورت کی دیت مل جائے گی۔ لیکن حضرت علیؓ سے یہ ثابت نہیں ہے۔ یہ دراصل بصرہ کے فقیہ عثمان البتی کا قول ہے[۱] یہ بھی آتا ہے کہ حضرت حسن بصریؒ اور عطاؒ کی رائے بھی وہی تھی جو جمہور کی رائے ہے[۲]

یہ کوئی مضبوط دلیل نہیں ہے کہ عورت کی دیت مرد کی دیت سے نصف ہے اس لیے مرد سے اسی وقت قصاص لیا جائے گا جب کہ آدھی دیت اسے دے دی جائے، اس لیے کہ دونوں کی قذف کی سزا ایک ہے۔ عورت اگر مرد پر زنا کی تہمت لگائے تو اسے جو سزا دی جائے گی وہی سزا مرد کو دی جائے گی اگر وہ عورت پر یہ تہمت باندھے۔ مرد کو یہ سزا دینے کے لیے اسے کوئی بدل یا رقم نہیں دی جائے گی۔ قصاص میں قاتل اور مقتول کی قیمت نہیں دیکھی جاتی ہے، اسی وجہ سے کسی ایک فرد کو پوری ایک جماعت مل کر قتل کرے تو قصاص میں سب ہی کو قتل کیا جائے گا[۳]

امام شوکانی فرماتے ہیں کہ قصاص کے مقصد اور حکمت سے بھی جمہور کے مسلک کی تائید ہوتی ہے۔ قصاص کی حکمت یہ ہے کہ انسان کا خون نہ بہے اور ظلم و زیادتی سے اس کی جان محفوظ رہے۔ اگر مرد سے عورت کا قصاص نہ لیا جائے تو کئی ایک اسباب کی بنا پر اس کی جان ضائع جاسکتی ہے۔ ایک سبب وراثت سے اسے محروم کرنا ہے۔ جو شخص وراثت میں اسے اس کا حصہ نہ دینا چاہے وہ اسے قتل کر بیٹھے گا۔ دوسرا سبب دورِ جاہلیت کی طرح ذِلت اور عار کا احساس ہے۔ خاص طور پر اس صورت میں جب کہ ان سے کوئی معمولی سی غلطی ہی سرزد ہو جائے۔ یہی غلط قسم کا احساس تھا جس کی وجہ سے جاہلیت میں لڑکیوں کو زندہ دفن کر دیا جاتا تھا۔ تیسرا سبب ان کی کم زوری ہے۔ جو شخص ان کو قتل کرنا چاہے اسے اس بات کا خوف نہیں ہوتا کہ وہ مردوں کی طرح

---

۱ فتح الباری: ۱۲/۱۶۰۔ نیز ملاحظہ ہو تفسیر کبیر: ۲/۱۰۸

۲ ابن قدامہ، المغنی: ۷/۶۷۹

۳ المغنی: ۷/۶۷۹

مدافعت کریں گی۔ لہٰذا قصاص میں رخصت یا ڈھیل ہو تو عورت پر زیادتی بڑھ جائے گی اور اس کی جان لینا آسان ہو جائے گا۔[1]

عورت کی جان کا قصاص عورت سے

اس تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ اس بات پر امت کا تقریباً اجماع ہے یا کم از کم ائمہ اربعہ اور جمہور امت کا اتفاق ہے کہ مرد کے قصاص میں عورت کو اور عورت کے قصاص میں مرد کو قتل کیا جائے گا۔ اب ایک سوال یہ باقی رہ جاتا ہے کہ قاتل اور مقتول دونوں ہی عورتیں ہوں تو کیا ان کے درمیان بھی قصاص کا یہ قانون نافذ ہوگا؟ اس کا جواب بالکل واضح ہے۔ جب ایک عورت کے قصاص میں مرد کی جان لی جاسکتی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ عورت کے قصاص میں عورت کو قتل نہ کیا جائے۔ قرآن نے صاف الفاظ میں کہا ہے وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى (البقرہ:۱۷۸) (عورت کے بدلہ عورت قتل کی جائے گی) چناں چہ فقہاء کے درمیان اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ عورت کے قصاص میں عورت کی جان لی جاسکتی ہے۔ قرآن شریف کے الفاظ عام ہیں اس سے فقہ حنفی میں یہ استدلال بھی کیا گیا ہے کہ کوئی آزاد عورت کسی باندی کو قتل کردے تو بھی اس سے قصاص لیا جائے گا۔[2]

عورت کے جراحات کا قصاص

اب جراحات اور زخموں کے قصاص کو لیجیے۔ اس کی بھی وہ ساری شکلیں بنتی ہیں جو قتل نفس قتل کی تھیں۔ (۱) عورت سے مرد کا قصاص لیا جائے (۲) مرد سے عورت کا قصاص لیا جائے۔ (۳) عورت کا عورت سے قصاص لیا جائے۔

قرآن مجید میں قصاص کا حکم اس آیت میں ہے۔

---

۱ نیل الاوطار: ۱۶۴/۷

۲ رد المحتار علی الدر المختار ۴۷۱/۵

وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَا أَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْأَنْفَ بِالْأَنْفِ وَالْأُذُنَ بِالْأُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوحَ قِصَاصٌ ط فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهٖ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهٗ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ○ (المائدۃ:۴۵)

ہم نے تورات میں یہودیوں پر فرض کر دیا تھا (یہی حکم اب اس امت کے لیے بھی ہے) کہ جان کے بدلہ جان، آنکھ کے بدلہ آنکھ، ناک کے بدلہ ناک، کان کے بدلہ کان اور دانت کے بدلہ دانت۔ اور دوسرے (خاص) زخموں کا بدلہ بھی ان کے برابر ہے۔ پھر جو شخص زیادتی کرنے والے کو معاف کردے تو یہ اس کے گناہوں کا کفارہ ہوگا۔ جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی ظالم ہیں۔

سوال یہ ہے کہ مرد عورت کی یا عورت مرد کی جان لے تو جس طرح ان سے قصاص لیا جاتا ہے، کیا اسی طرح اگر وہ دونوں ایک دوسرے کو جسمانی طور پر مجروح کریں اور نقصان پہنچائیں تو ان سے قصاص لیا جائے گا؟ یا ان دونوں کے احکام الگ ہیں؟

حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اہلِ عرب عورت کے قصاص میں مرد کو قتل نہیں کرتے تھے بلکہ عورت کے قصاص میں عورت کو اور مرد کے قصاص میں مرد کو قتل کرتے تھے۔ اس آیت میں بتایا گیا کہ مسلمان مرد اور عورت، اگر وہ آزاد ہیں تو ایک دوسرے کے مساوی ہیں۔ ایک نے دوسرے کی عمداً جان لی یا اس سے کم تر درجہ کا نقصان پہنچایا تو اس سے برابر کا قصاص لیا جائے گا۔[1]

امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ صحابہ وتابعین اور بعد کے علماء میں سے جمہور نے اس آیت سے یہ استدلال کیا ہے کہ قصاص کا یہ قانون مردوں اور عورتوں کے درمیان بھی

---

[1] مزید فرماتے ہیں کہ یہی اصول غلاموں اور لونڈیوں کے مابین بھی جاری ہوگا۔ ابن جریر، تفسیر:۶۰/۲ غلاموں اور لونڈیوں کا مسئلہ اس وقت زیر بحث نہیں ہے۔ اس سے بحث کسی دوسرے موقع پر ہم ان شاء اللہ کریں گے۔

جاری ہوگا۔ ان میں سے ایک دوسرے کے قاتل کو قتل کیا جائے گا اور جو جسمانی ضرر اور نقصان پہنچائے اس سے اس کے مساوی قصاص لیا جائے گا۔[۱] مثال کے طور پر مرد عورت کا اور عورت مرد کا ہاتھ توڑ دے تو قصاص میں اس کا ہاتھ بھی توڑ دیا جائے گا لیکن اگر نقصان کی کوئی ایسی صورت ہو جس میں برابر قصاص لینا ممکن نہ ہو تو دیت لی جائے گی۔

حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ ان کی پھوپھی رُبَیِّع نے ایک انصاری لڑکی کا دانت توڑ دیا۔ ربیع کے لوگ چاہتے تھے کہ معاف کر دیا جائے یا دیت لی جائے لیکن لڑکی کے خاندان والے قصاص پر اصرار کر رہے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مقدمہ پہنچا تو آپؐ نے قصاص کا حکم دیا اس پر حضرت انس کے چچا (ربیع کے بھائی) نے کہا، اے اللہ کے رسول! خدا کی قسم ربیع کا دانت توڑا نہیں جائے گا۔ (یہ بات انھوں نے آپؐ کی تردید اور مخالفت میں نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت پر یقین کی وجہ سے یا اس اعتماد پر کہ وہ لڑکی کے رشتہ داروں کو عفو و درگزر یا دیت پر آمادہ کر سکیں گے، کہی تھی) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے انس! کتاب اللہ کا حکم قصاص کا ہے یہ تو ضرور لیا جائے گا۔ اس کے تھوڑی دیر بعد لڑکی والے قصاص کی جگہ دیت لینے پر آمادہ ہو گئے۔ اس پر آپؐ نے فرمایا۔ اللہ کے بعض بندے ایسے ہیں کہ وہ قسم کھا لیں تو اللہ اسے پوری کر دیتا ہے۔[۲]

یہ بخاری وغیرہ کی روایت ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ایک عورت دوسری عورت کو زخمی کر دے تو قصاص لیا جائے گا۔ مسلم کی روایت میں ہے کہ ربیع کی بہن ام حارثہ نے ایک شخص کو زخمی کر دیا۔ یہ جھگڑا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچا تو آپؐ نے فرمایا اس سے قصاص لیا جائے گا۔ اس پر ربیع کی ماں نے کہا کہ کیا ام حارثہ سے قصاص لیا جائے گا، خدا کی قسم ایسا نہیں ہوگا۔ آپؐ نے ان سے فرمایا سبحان اللہ! ام الربیع

---

[۱] شرح مسلم: ۲/۵۹

[۲] بخاری، کتاب الصلح، باب الصلح فی الدیۃ۔ کتاب التفسیر (سورۃ البقرہ) باب یا ایہا الذین امنوا کتب علیکم القصاص (سورہ المائدہ) باب قولہ والجروح قصاص۔ ابو داؤد، کتاب الدیات باب القصاص فی السن۔

تم کیسی باتیں کرتی ہو۔ اللہ کی کتاب کا قانون ہے کہ قصاص لیا جائے۔ لیکن جو شخص زخمی ہوا تھا اس کے لوگ بعد میں دیت پر راضی ہوگئے۔ اس پر آپؐ نے فرمایا اللہ کے کچھ بندے ایسے ہوتے ہیں کہ اگر وہ قسم کھالیں تو اسے وہ پوری کر دیتا ہے[1]

امام نوویؒ فرماتے ہیں اس حدیث سے کئی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔

منها اثبات القصاص بين الرجل والمرأة[2] — ان میں سے ایک یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ مرد اور عورت کے درمیان قصاص ہوگا۔

اب صحابہ و تابعین کے بعض اقوال پیش کیے جا رہے ہیں جن سے عورت سے مرد کے قصاص اور مرد سے عورت کے قصاص کا ثبوت ملتا ہے۔

امام بخاری فرماتے ہیں، حضرت عمرؓ سے روایت کی جاتی ہے کہ انھوں نے فرمایا۔

تقاد المرأة من الرجل فی کل عمد يبلغ نفسه فما دونها من الجراح[3] — عورت عمداً اگر مرد کو قتل کردے یا اس سے کم تر درجہ میں کوئی چوٹ ہی پہنچا دے تو اس سے قصاص لیا جائے گا۔

جب عورت سے مرد کے قتل اور جراحات یا زخموں کا قصاص لیا جائے گا مرد

---

[1] مسلم، کتاب القسامہ، باب اثبات القصاص فی الاسنان الخ۔ امام بخاری نے یہ روایت ترجمہ باب میں نقل کی ہے۔ کتاب الدیات، باب القصاص بین الرجال والنساء الخ۔ دونوں روایتوں کی تفصیلات میں جو اختلاف ہے اس کی بنا پر امام بیہقی فرماتے ہیں کہ یہ ایک نہیں بلکہ دو الگ الگ واقعات ہیں لیکن ابن ترکمانی نے اسے دو واقعات ماننے سے انکار کیا ہے۔ السنن الکبریٰ مع الجوہر النقی: ۶۴،۳۹/۸۔ علامہ ابن حزم کی رائے یہ ہے کہ یہ ایک ہی عورت کے دو واقعات ہیں۔ ایک میں اس نے ایک شخص کو زخمی کیا تو رسول اللہ ﷺ نے دیت کا فیصلہ فرمایا دوسرے میں انھوں نے دانت توڑا تو قصاص کا فیصلہ ہوا۔ پہلے واقعہ میں قسم کھانے والی ان کی ماں تھیں اور دوسرے میں ان کے بھائی نے قسم کھائی۔ فتح الباری ۱۲/۱۷۳، ۱۷۴۔ لیکن یہ تفصیل روایات سے پوری طرح ہم آہنگ نہیں معلوم ہوتی۔ امام نوویؒ نے بھی انھیں دو واقعات ہی قرار دیا ہے۔ شرح مسلم: ۵۹/۲

[2] شرح مسلم: ۵۹/۲

[3] بخاری، کتاب الدیات، باب القصاص بین الرجال والنساء

سے عورت کا بھی قصاص لیا جانا چاہیے۔ چناں چہ حضرت عمرؓ ہی سے مروی ہے۔

جرح الرجال و النساء سواء[1]	مردوں اور عورتوں کے زخم مساوی ہیں۔

حضرت عمر بن عبد العزیزؒ فرماتے ہیں:

القصاص في ما بين المرأة و الرجل حتّٰی فی النفس[2]	عورت اور مرد کے درمیان قصاص کا قانون نافذ ہوگا حتی کہ نفس کے معاملہ میں بھی۔

دور تابعین کے مشہور فقہاء سبعہ[3] اور ان ہی جیسے دوسرے علماء اور فقہاء کے بارے میں ابو الزناد فرماتے ہیں۔

انهم كانوا يقولون المرأة تقاد من الرجل عينا بعين و اذنا باذن وكل شيء من الجراح علىٰ ذالک و ان قتلها قتل بها[4]	عورت سے مرد کا قصاص لیا جائے گا۔ آنکھ کے بدلہ آنکھ، کان کے بدلہ کان ہر طرح کے زخم کے بدلہ اسی کے مساوی زخم۔ (اسی طرح مرد سے بھی عورت کا قصاص لیا جائے گا) اور مرد اسے قتل کردے تو اسے قتل کیا جائے گا۔

اوپر سورۂ مائدہ کی جو آیت گزر چکی ہے اس سے استدلال کرتے ہوئے امام مالک فرماتے ہیں۔

القصاص يكون بين النساء كما يكون بين الرجال والقصاص ايضا يكون بين الرجال والنساء[5]	عورتوں کے درمیان اسی طرح قصاص ہوگا، جس طرح مردوں کے درمیان ہوتا ہے، اور مردوں اور عورتوں کے درمیان بھی قصاص ہوگا۔

1۔ فتح الباری: ۱۲/۱۷۳

2۔ حوالۂ سابق

3۔ فقہائے سبعہ سے حسب ذیل سات فقہاء مراد ہیں۔ حضرت سعید بن مسیب، عروہ بن زبیر، قاسم بن محمد، ابوبکر بن عبد الرحمٰن، خارجہ بن زید بن ثابت، عبید اللہ بن عبد اللہ اور سلیمان بن یسار رحمہم اللہ

4۔ السنن الکبریٰ: ۸/۴۰

5۔ موطا امام مالک، کتاب العقول: القصاص فی القتل

علامہ ابن قدامہ حنبلی کہتے ہیں کہ جن افراد کے درمیان ایک دوسرے سے نفس کا قصاص لیا جاتا ہے ان میں جراحات کا قصاص بھی ایک دوسرے سے لیا جائے گا۔ یہی امام مالک، امام ثوری، امام شافعی، اسحٰق بن راہویہ، ابوثور اور امام احمد کی رائے ہے۔[1]

اس اصول کے تحت چوں کہ مرد کے قصاص میں عورت کی اور عورت کے قصاص میں مرد کی جان لی جاتی ہے لہٰذا وہ ایک دوسرے کو زخم پہنچائیں تو اس کا بھی ان سے قصاص لیا جائے گا۔

فقہ حنفی کی رو سے عورت اور مرد کے درمیان نفس کا قصاص تو ہے لیکن جراحات کا قصاص نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان میں سے جو بھی دوسرے کو قتل کرے قصاص میں اسے قتل کیا جائے گا لیکن فرض کیجیے عورت مرد کا یا مرد عورت کا ہاتھ قطع کردے تو قصاص میں ان میں سے کسی کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا بلکہ دیت لی جائے گی۔ قتل سے عورت کی بھی جان جائے گی اور مرد کی بھی۔ جان کا ضیاع دونوں میں مشترک ہے، اس لیے دونوں سے ایک دوسرے کا قصاص لیا جائے گا۔ لیکن اعضاء کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ ان کی نوعیت مال کی ہے۔ مال بھی نفس کے تحفظ کے لیے ہوتا ہے اور اعضاء جسم کا مقصد بھی یہی ہے۔ ان میں قصاص اسی وقت ہوگا جب کہ ان کی قیمت ایک ہو، لیکن شریعت نے عورت کے اعضاء کی دیت مرد کی دیت سے کم رکھی ہے (اس سے ہم آگے چل کر بحث کریں گے) جب دونوں کی مالیت میں فرق ہے تو ان کے درمیان قصاص نہیں ہوگا۔

سورۂ مائدہ کی آیت ۴۵ میں قصاص کا جو حکم دیا گیا ہے وہ مطلق نہیں ہے۔ یہ بات سب ہی کے نزدیک تسلیم شدہ ہے کہ حربی یا مستامن کا قصاص نہیں لیا جاتا۔ جب آیت کے حکم سے اسے مستثنیٰ کیا گیا ہے تو حدیث کے ذریعہ عورت کو بھی مستثنیٰ کیا جاسکتا ہے۔

---

[1] المغنی: ۷/۶۷۹، ۶۸۰

اگر یہ کہا جائے کہ مردوں کے ہاتھ چھوٹے بڑے ہوتے ہیں اور توانائی اور قوتِ گرفت کے لحاظ سے ان میں فرق بھی ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود ان کے درمیان قصاص میں فرق نہیں کیا جاتا تو عورت اور مرد کے ہاتھ میں جو فرق ہے اس کا بھی اعتبار نہیں ہونا چاہیے، اس کا جواب یہ ہے کہ عورت اور مرد کے اعضاء کی دیت میں چوں کہ فرق کیا گیا ہے اس لیے اس کا تو اعتبار کیا جائے گا لیکن مردوں کے ہاتھوں میں جو فرق ہے اس کا اعتبار نہیں کیا جاسکتا، اس لیے کہ اس کا کوئی ضابطہ نہیں ہے لہٰذا انھیں ایک دوسرے کے مساوی سمجھا جائے گا[1]

ایک اعتراض یہ بھی کیا جاتا ہے کہ اعضاء کے قصاص میں دیت کی برابری کو بنیاد مانا جائے تو کم از کم عورت سے مرد کا قصاص لینا غلط نہ ہوگا۔ اس لیے کہ مرد کے اعضا کی دیت عورت کے اعضاء کی دیت سے زیادہ ہے۔ جو چیز زیادہ قیمتی ہے اس کا قصاص کم قیمت والی چیز سے کیوں نہیں لیا جاسکتا۔ مثال کے طور پر اگر عورت مرد کا ہاتھ کاٹ دے تو اس کا ہاتھ کاٹ دینا بدرجہ اولیٰ صحیح ہوگا۔ اس لیے کہ مرد کے ہاتھ کی دیت عورت کے ہاتھ کی دیت کے برابر ہی نہیں، اس سے زیادہ ہے۔ حالاں کہ فقہ حنفی میں اسے بھی صحیح نہیں قرار دیا گیا ہے[2]

فقہ حنفی کا مشہور مسلک یہی ہے لیکن فقہ حنفی ہی میں ایک رائے اس کے جواز کی بھی ملتی ہے۔ اس کے لحاظ سے عورت اگر مرد کا ہاتھ کاٹ دے تو قصاص میں اس کا ہاتھ بھی کاٹا جاسکتا ہے[3] اس رائے کو اگر مان لیا جائے تو یہ اعتراض ختم ہو جاتا ہے۔

سر اور چہرے کے زخموں[4] کے بارے میں ایک رائے فقہ حنفی میں یہ ہے کہ ان

---

[1] ہدایہ: ۴/ ۵۶۶۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھی جائے کفایہ: ۵/ ۱۲۶۷

[2] ابن قدامہ، المغنی: ۷/ ۶۸۰

[3] در المختار: ۵/ ۴۸۸

[4] ان زخموں کو 'شجاج' کہا جاتا ہے۔ ان کی قسمیں، ان کے احکام، کن اقسام میں قصاص واجب ہوتا ہے اور کن میں دیت؟ اس کی تفصیل کے لیے دیکھی جائے ہدایہ: ۴/ ۵۸۶-۵۸۸

میں بھی عورت اور مرد کے درمیان قصاص نہ ہوگا۔ اس لیے کہ قصاص کے لیے منفعت اور قیمت میں برابری ضروری ہے۔ عورت اور مرد کے درمیان یہ برابری نہیں ہے۔ لیکن ایک رائے یہ بھی ہے کہ ان زخموں میں عورت اور مرد کے درمیان قصاص ہوگا، اس لیے کہ اعضا و جوارح کے قصاص اور ان زخموں کے قصاص میں فرق ہے۔ اعضاء و جوارح کٹ جائیں تو منفعت ختم ہو جاتی ہے اور عیب لاحق ہوتا ہے لیکن چہرہ کے زخموں میں منفعت میں تو کوئی فرق نہیں آتا البتہ عیب پیدا ہو جاتا ہے۔ اس میں مرد اور عورت دونوں برابر ہیں۔[1]

صرف چہرہ کے زخموں ہی سے عیب نہیں پیدا ہوتا اعضا وجوارح کے کٹ جانے سے بھی عیب پیدا ہوتا ہے جب عیب کی بنیاد پر چہرہ کے زخموں کا قصاص ایک دوسرے سے لیا جاسکتا ہے تو اعضا و جوارح کا قصاص بھی لیاجانا چاہیے۔ بہر حال منفعت کے سوال کو چھوڑ کر صرف عیب کے پہلو کو سامنے رکھا جائے تو فقہ حنفی کی رائے پر مزید غور وفکر کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اس معاملہ میں دیگر ائمہ اور جمہور کا مسلک ہی زیادہ قوی معلوم ہوتا ہے۔ یعنی یہ کہ اعضا و جوارح کے قصاص میں بھی عورت اور مرد کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔

---

[1] ردالمحتار علی الدر المختار: ۴۸۸/۵

عورت کی دیت

ناحق کسی کی جان لینے یا اسے جسمانی نقصان پہچانے پر شریعت نے جو مالی معاوضہ رکھا ہے اسے دیت کہا جاتا ہے۔ اسلام کے قانون دیت پر ایک اعتراض یہ ہے کہ اس میں عورت اور مرد کے درمیان فرق کیا گیا ہے جو صحیح نہیں ہے۔

فقہاء کے اختلافات

یہ ایک فقہی بحث ہے۔ اس میں فقہاء کی رائیں اور مسالک مختلف ہیں۔ ذیل میں اس کی تفصیل اور تجزیہ کی کوشش کی جائے گی۔

عورت کی دیت مرد کی دیت کے نصف ہے

فقہاء احناف کے نزدیک عورت کی دیت، چاہے وہ جان کی ہو یا اعضاء و جوارح کی، مرد کی دیت کے نصف ہے[1]

یہی امام شافعی، حضرت سفیان ثوری، امام لیث اور ابوثور وغیرہ کی رائے ہے[2]

اس کی دلیل حضرت معاذ بن جبلؓ کی یہ روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔

دیة المرأة علی النصف من دیة الرجل[3] — عورت کی دیت مرد کی دیت کے نصف ہے۔

---

[1] ہدایہ: ۵۸۶/۴

[2] بدایۃ المجتہد: ۴۶۳/۲۔ المغنی: ۷۹۷/۷

[3] بیہقی، السنن الکبریٰ: ۹۵/۸

اس روایت کی سند کم زور ہے[1] البتہ حضرت علی فرماتے ہیں۔

جراحات النساء علی النصف من دیة الرجل فی ما قل و کثر[2]	عورت کے جراحات کی دیت مرد کی دیت کے نصف ہے، چاہے وہ کم ہو یا زیادہ۔

ابراہیم نخعی، حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ دونوں سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے فرمایا:

عقل المرأة علی النصف من دیة الرجل فی النفس وما دونها[3]	عورت کی دیت مرد کی دیت کے نصف ہے چاہے وہ جان کی دیت ہو یا اس سے کم کسی نقصان کی۔

یہی رائے حضرت عبد اللہ بن عمرؓ اور حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کی بھی بیان کی جاتی ہے۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ مجھے ان کی یہ رائے کہیں نہیں ملی[4]

سوال یہ ہے کہ عورت کی دیت مرد کی دیت سے نصف کیوں ہے؟ اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ مرد چوں کہ خاندان کا کفیل ہوتا ہے اور اس کا معاشی بوجھ اُٹھاتا ہے اس لیے اس کے انتقال سے خاندان کا مالی نقصان اس سے کہیں زیادہ ہوتا ہے جتنا عورت کے انتقال سے ہوتا ہے، اس لیے عورت کی دیت سے مرد کی دیت دُگنی رکھی گئی ہے۔ رشید رضا مصری کہتے ہیں:

والاصل فی ذالک ان المنفعة التی تفوت اھل الرجل بفقدہ اکبر من المنفعة التی تفوت	اس مسئلہ میں بنیادی بات یہ ہے کہ مرد کے انتقال سے اس کے گھر والے جس فائدہ سے محروم ہوتے ہیں وہ اس فائدہ سے بہت بڑا ہے جس سے انھیں عورت

---

[1] بیہقی، السنن الکبریٰ: ۹۶/۸

[2] حوالہ سابق

[3] بیہقی: السنن الکبریٰ ۹۶/۸۔ امام بیہقی کہتے ہیں یہ روایت منقطع ہے لیکن اوپر کی روایت کی تائید کرتی ہے۔ حضرت عمرؓ سے اس سے مختلف روایت بھی آتی ہے۔ السنن الکبریٰ: ۹۷/۸

[4] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔ التلخیص الجبیر: ۳۳۹/۲

بفقد الانثیٰ ففقدرت بحسب الارث[1]	کے انتقال کی وجہ سے محروم ہونا پڑتا ہے۔ لہٰذا میراث میں جس طرح مرد کا حصہ دوگنا ہے اسی طرح دیت بھی اس کی دُگنی رکھی گئی۔

ایک اور بات بھی کہی گئی ہے۔ وہ یہ کہ اسلامی قانون کی رو سے بعض اہم دینی مناصب کے لیے مرد ہی کو موزوں سمجھا گیا ہے۔ جیسے نماز اور حج کی امامت، اس کے علاوہ ریاست کی سر براہی، فوجی خدمات، سرحدوں کی حفاظت جیسی اجتماعی ذمہ داریوں کا بوجھ بھی مرد ہی پر ڈالا گیا ہے۔ خالص دنیوی معاملات میں بھی جو صنعتیں اور پیشے انسان کی بقا کے لیے ضروری ہیں ان میں بھی اس کا حصہ زیادہ ہے۔ اس لحاظ سے مرد کے قتل سے خاندان ہی کا نہیں پورے معاشرہ کا جو نقصان ہوتا ہے وہ اس نقصان سے زیادہ ہے جو عورت کے قتل سے ہوتا ہے۔ اس لیے فطری طور پر اس کی دیت بھی عورت کی دیت سے دو چند رکھی گئی ہے[2]

اس میں شک نہیں ان دلائل میں کافی وزن ہے۔ لیکن احکام شریعت کا فیصلہ محض عقلی دلائل کی بنیاد پر نہیں ہوتا اس کے لیے قرآن و سنت سے مضبوط دلائل کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس مسئلہ میں جن روایات اور آثار کو پیش کیا جاتا ہے، جیسا کہ ہم نے عرض کیا، وہ کچھ زیادہ قوی نہیں ہیں۔

ثلثِ دیت کے بعد عورت کی دیت نصف ہے

امام مالک اور امام احمد وغیرہ کے نزدیک ایک ثلث دیت تک مرد اور عورت کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے البتہ ایک ثلث کے بعد عورت کی دیت مرد کی دیت کے

---

[1] تفسیر المنار: ۳۳۳/۵

[2] ملاحظہ ہو۔ اعلام الموقعین: ۱۱۲/۲

نصف ہو جائے گی[1] اس کی دلیل حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاصؓ کی یہ روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

عقل المرأة مثل عقل الرجل حتی یبلغ الثلث من دیتها[2]	عورت کی دیت مرد کی دیت کے برابر ہے۔ یہاں تک کہ اس کی دیت ایک ثلث کو پہنچ جائے۔

اس روایت میں بھی ضعف ہے[3]

اس مسلک کی تائید میں حضرت زید بن ثابتؓ کا یہ قول پیش کیا جاتا ہے۔ فرماتے ہیں۔

جراحات الرجال والنساء سواء الی الثلث فما زاد فعلی النصف[4]	مرد اور عورتوں کے زخموں کی دیت ایک ثلث تک برابر ہے جو زیادہ ہو وہ عورت کی دیت مرد کی دیت کے نصف ہوگی۔

اسی قسم کی ایک روایت حضرت عمرؓ سے بھی منقول ہے[5]

حضرت سعید بن مسیبؒ فرماتے ہیں کہ ایک تہائی دیت تک عورت اور مرد کی دیت برابر ہوگی۔ چاہے وہ انگلی کی ہو یا دانت کی، جسم کے زخم کی ہو یا سر کے چوٹ کی (اس کے بعد اس کی دیت مرد کی دیت سے نصف ہو جائے گی)

امام مالک فرماتے ہیں امام زہریؒ اور عروہ بن زبیرؓ کی رائے بھی وہی ہے جو

---

۱ المغنی: ۷/ ۷۹۷-۷۹۸

۲ نسائی، ابواب القسامہ، عقل المرأة۔ دارقطنی کتاب الحدود والدیات ص ۳۲۶، ۳۲۷

۳ ملاحظہ ہو بیہقی: ۸/ ۹۶۔ التعلیق المغنی: ص ۳۲۷۔ علامہ زرقانی کہتے ہیں۔ اسنادہ ضعیف۔ شرح الزرقانی علی المؤطا: ۴/ ۳۴

۴ بیہقی: ۸/ ۹۶

۵ حوالہ سابق

حضرت سعید بن مسیّبؒ کی رائے ہے[1]

کہا جاتا ہے کہ یہی جمہور اہلِ مدینہ اور تابعین کے مشہور فقہاء سبعہ، حضرت عمر بن عبد العزیزؒ امام لیث، قتادہ وغیرہ کی رائے ہے[2]

قاضی ابن رشد مالکی ہیں، وہ ان دلائل کے بارے میں فرماتے ہیں **ولا اعتماد للطائفة الاولیٰ الا مراسیل**[3] (پہلے گروہ ـــــ اس سے مراد امام مالک وغیرہ ہیں ـــــ کا اعتماد اس مسئلے میں صرف چند مرسل روایات پر ہے۔)

یہ ان کی سندوں کا حال ہے۔ اب اس پر عقلی پہلو سے غور کیجیے۔ سوال یہ ہے کہ اس کی کیا حکمت ہے کہ ایک تہائی دیت تک تو عورت اور مرد دونوں کو مساوی قرار دیا جائے اور ایک تہائی کے بعد دونوں میں فرق کر کے عورت کی دیت کو مرد کی دیت کا نصف کر دیا جائے؟

اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ ایک تہائی دیت میں بھی نصف کر دیا جائے تو اس کی افادیت کم ہو جاتی ہے اور عورت کے نقصان کی تلافی نہیں ہو پاتی، اس لیے تہائی تک تو مرد اور عورت دونوں میں فرق نہیں کیا گیا البتہ اس کے بعد فرق کیا گیا[4]

اوپر کی روایات کو اگر مان لیا جائے تو یہ جواب بہ ظاہر بہت معقول معلوم ہوتا

---

[1] موطا امام مالک، کتاب العقول، باب عقل المرأۃ

[2] زرقانی، شرح المؤطا: ۴/۳۴۔ ابن قدامہ نے یہاں تک لکھا ہے کہ اس پر دور صحابہ میں گویا اجماع ہو چکا ہے۔ صرف حضرت علیؓ کی ایک رائے اس کے خلاف بیان کی جاتی ہے۔ لیکن یہ ان سے ثابت نہیں ہے۔ المغنی: ۷/ ۷۹۸۔ اس پر یہی عرض کیا جا سکتا ہے کہ اجماع کا دعویٰ جتنا آسان ہے اس کا ثابت کرنا شاید اتنا آسان نہیں ہے۔

[3] بدایۃ المجتہد: ۲/۴۶۳

[4] اعلام الموقعین: ۲/۱۱۲

ہے لیکن اس پر ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہ اس اصول کے تحت جن جراحات اور زخموں پر عورت کو ایک تہائی دیت ملتی ہے ان سے بڑے جراحات پر اس کی دیت تہائی سے بھی کم ہو جاتی ہے۔ حالاں کہ عقل کا صریح تقاضا ہے کہ عورت کے نقصان کے تناسب سے اس کی دیت میں اضافہ ہونا چاہیے۔ چناں چہ موطا کی روایت کے مطابق ربیعہ بن عبد الرحمٰنؒ اور حضرت سعید بن مسیّبؒ کے درمیان اس مسئلہ پر حسب ذیل گفتگو ہوئی۔

ربیعہ! حضرت! عورت کی ایک انگلی کی دیت کیا ہوگی؟

سعید بن مسیّبؒ! دس اونٹ

ربیعہ! دو انگلیوں کی دیت؟

سعید بن مسیّبؒ! بیس اونٹ

ربیعہ! تین انگلیوں کی دیت؟

سعید بن مسیّبؒ! تیس اونٹ

ربیعہ! اچھا تو چار انگلیوں کی دیت؟

سعید بن مسیّبؒ! بیس اونٹ (اس لیے کہ ایک آدمی کی جان کی دیت سو اونٹ ہے۔ عورت کی دیت جب ایک تہائی سے بڑھ جائے تو ان کے نزدیک آدھی ہو جاتی ہے۔)

ربیعہ! جب عورت کا زیادہ نقصان ہو اور اس کی تکلیف بڑھ جائے تو کیا دیت کم ہو جائے گی؟

سعید بن مسیّبؒ! کیا تم عراقی ہو جو عقل لڑا رہے ہو اور نص کے مقابلہ میں قیاس کرتے ہو؟

ربیعہ! نہیں میں ایک طالب علم ہوں۔ مسئلہ کی نوعیت جاننا چاہتا ہوں۔

سعید بن مسیّبؒ! بیٹے یہی سنت ہے[1]

متاخرین میں امام شوکانی اسی رائے کے قائل ہیں کہ ثلثِ دیت کے بعد عورت کی دیت مرد کی دیت سے نصف ہوتی ہے۔ لیکن وہ اس اعتراض میں وزن محسوس کرتے ہیں کہ اس طرح ثلثِ دیت کے بعد عورت کی دیت اس وقت کم ہو جاتی ہے جب کہ عقل کا صریح تقاضا ہے کہ اسے زیادہ ہونا چاہیے۔ ان کے نزدیک ایک تہائی دیت تک عورت اور مرد کی دیت ایک ہوگی۔ ایک تہائی کے بعد جو زائد دیت ہوگی صرف اس میں نصف ہو جائے گی۔ مثلاً جہاں چالیس اونٹ دیت میں مرد کو ملیں گے وہاں عورت کی دیت پینتیس ۳۵ ہوگی۔ وہ فرماتے ہیں کہ عبد اللہ بن عمرو بن العاصؓ کی جو روایت اس ذیل میں پیش کی جاتی ہے وہ اس مفہوم کے لینے میں مانع نہیں ہے۔ باقی رہی حضرت سعید

---

[1] مؤطا امام مالک، کتاب العقول، باب ماجاء فی عقل الاصابع۔ حضرت سعید بن مسیّبؒ تابعی ہیں۔ ان کی یہ روایت مرسل ہے۔ اس لیے کہ اس میں اس صحابی کا ذکر نہیں ہے جس سے انھیں یہ علم ہوا کہ دیت کے مسئلہ میں یہی سنت ہے۔ علامہ ابن عبد البر کہتے ہیں کہ علما کا اتفاق ہے کہ سعید بن مسیّبؒ کی مرسل روایات دوسروں کی مرسل روایات کے مقابلہ میں زیادہ صحیح ہوتی ہے۔ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ چھان بین سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی اس طرح کی روایات کی سند موجود ہے۔ زرقانی، شرح مؤطا: ۴؍۳۹۔ لیکن سوال یہ ہے کہ حضرت سعید بن مسیّب نے اسے سنت کس معنی میں کہا ہے؟ امام شافعی کہتے ہیں کہ ممکن ہے ان کا یہ قول رسول اللہؐ ہی سے منقول ہو اور اس کا بھی امکان ہے کہ ان کے عام اصحاب علم کی یہ رائے ہو۔ پہلے میری بھی یہی رائے تھی۔ پھر میں نے یہ رائے ترک کر دی۔ اور اللہ سے دعا کرتا رہا اس لیے کہ بعض اوقات لوگ ایک بات کو سنت کہتے ہیں لیکن رسول اللہ ﷺ سے اس کا ثبوت نہیں ملتا۔ لہٰذا اس مسئلہ میں صحیح طریقہ یہی ہے کہ قیاس کیا جائے۔ (اور وہ امام شافعیؒ کے نزدیک، جیسا کہ گزر چکا یہ ہے کہ عورت کی دیت چھوٹی ہو یا بڑی مرد کی دیت کی نصف ہوگی) باقی رہا حضرت زید بن ثابت کا قول تو اس کے مقابلہ میں حضرت علیؓ کا قول ہے (دونوں اقوال اوپر گزر چکے ہیں) وہ بھی اسی طرح ثابت ہے جس طرح یہ ثابت ہے۔ بیہقی: السنن الکبریٰ: ۸؍۹۶۔ مزید فرماتے ہیں کہ امام مالک بھی اسے سنت کہا کرتے تھے۔ چناں چہ میں اس مسئلہ میں ان کی اتباع کرتا تھا۔ لیکن مجھے کھٹک ضرور تھی۔ پھر بھی معلوم ہوا کہ سنت سے ان کی مراد اہل مدینہ کی سنت ہے۔ اس کے بعد میں نے اس سے رجوع کر لیا۔ التلخیص الحبیر: ۲؍۳۴۰

بن مسیبؒ کی روایت تو یہ مرسل ہے اس لیے ناقابل قبول ہے۔ یہی نہیں بلکہ وہ لکھتے ہیں کہ حدیث کا یہ مفہوم لینا ضروری ہے۔

لئلا یقتحم الانسان فی مضیق مخالف للعدل والعقل والقیاس بلا حجة نیّرة[1]	تا کہ انسان عدل و انصاف، عقل اور قیاس کے مخالف تنگنائے میں بغیر کسی واضح دلیل کے پھنس نہ جائے۔

بعض اور اختلافات

دیت کے مسئلہ میں اور بھی اختلافات ہیں۔ جو لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ ثلث دیت کے بعد عورت کی دیت نصف ہو جاتی ہے ان کی درمیان یہ اختلاف ہے کہ فی نفسہٖ ثلث اس میں داخل ہے یا نہیں؟ ایک رائے یہ ہے کہ ایک ثلث سے پہلے عورت اور مرد کی دیت مساوی ہوگی۔ جیسے ہی وہ ایک ثلث کو پہنچے گی نصف ہو جائے گی۔ دوسری رائے یہ ہے کہ ثلث تک دونوں کی دیت برابر ہوگی۔ ثلث کے بعد نصف ہوگی۔ ابن قدامہ حنبلی نے پہلی رائے کو ترجیح دی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ روایت کے الفاظ 'حتی یبلغ الثلث' (یہاں تک کہ وہ ثلث کو پہنچ جائے) بتا رہے ہیں کہ ثلث سے کم ہی میں مرد اور عورت کی دیت برابر ہوگی۔[2]

بعض حضرات ثلث دیت تک بھی عورت اور مرد کی دیت میں برابری کے قائل نہیں ہیں۔ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ دانت کی دیت اور موضحہ (وہ زخم جس سے ہڈی نظر آنے لگے) کی دیت تو عورت اور مرد کی برابر ہوگی اس کے بعد عورت کی دیت مرد کی دیت کے نصف ہو جائے گی۔[3]

---

[1] نیل الاوطار: ۲۲۶/۷

[2] المغنی: ۷۹۸/۷

[3] بیہقی، السنن الکبریٰ: ۹۶/۸

حدیث میں آتا ہے کہ دانت کی دیت پانچ اونٹ ہے[1] اور موضحہ کی دیت بھی یہی بیان ہوئی ہے[2] اس کا مطلب یہ ہے کہ صرف پانچ اونٹ تک عورت اور مرد کی دیت میں کوئی فرق نہیں ہوگا۔ اس کے بعد عورت کی دیت آدھی ہو جائے گی۔ قاضی شریح کا بھی یہی مسلک بتایا جاتا ہے۔ ایک رائے یہ بھی ملتی ہے کہ پندرہ اونٹ تک دونوں کی دیت ایک ہوگی اس کے بعد آدھی ہو جائے گی[3]

تقریباً یہی رائے بعض علمائے متاخرین کے یہاں بھی ملتی ہے۔ علامہ عبد الرؤف مناوی جو شافعی ہیں، فرماتے ہیں کہ عورت کے اعضاء وجوارح کی دیت ثلث تک مرد ہی کی دیت کی طرح ہے لیکن جب وہ بڑھ کر نصف تک پہنچ جائے تو عورت کی دیت مرد کی دیت کی آدھی ہوگی[4]

ٹھیک یہی بات علامہ محمد بن عبد الہادی سندھی نے بھی کہی ہے جو حنفی المسلک ہیں[5]

اس طرح جمہور کا اصولاً اس پر تو اتفاق ہے کہ عورت کی دیت مرد کی دیت کے نصف ہوگی۔ لیکن اس کی تفصیلات میں ان کے درمیان بڑا اختلاف ہے۔ عورت کی ہر چھوٹی بڑی دیت مرد کی دیت کی نصف ہوگی یا زائد از ثلث کی نصف ہوگی یا کل دیت کی جب آدھی ہوجائے تو اس کی نصف ہوگی؟ اس کے علاوہ اور بھی اختلافات ہیں۔

---

۱ نسائی، قسامہ، عقل الاسنان

۲ ابوداؤد، کتاب الدیات باب دیات الاعضا۔ ترمذی، ابواب الدیات۔ باب ماجاء فی الموضحہ۔ نسائی، قسامہ، المواضح۔ فقہ حنفی میں بھی یہی دیت بیان ہوئی ہے۔ ہدایہ:۴/۵۸۶، ۵۸۷

۳ قاضی شوکانی کہتے ہیں: وھذہ الاقوال لا دلیل علیھا یعنی ان سب اقوال کے پیچھے کوئی دلیل نہیں ہے۔ نیل الاوطار:۷/۲۲۷

۴ التیسیر بشرح الجامع الصغیر:۲/۱۳۳

۵ حاشیۃ السندی علی النسائی:۷/۲۴۷

اس کی وجہ یہ ہے کہ اس مسئلہ میں قرآن مجید میں کوئی واضح اور دوٹوک ہدایت نہیں ہے، جو احادیث پیش کی جاتی ہیں وہ اتنی قوی نہیں ہیں کہ ان کی بنیاد پر کوئی قطعی فیصلہ کیا جاسکے۔ صحابہ اور تابعین کے اقوال بھی مختلف ہیں۔ اسی وجہ سے فقہاء کی رایوں میں بھی اختلاف ہوا ہے۔ ان تمام رایوں کی گنجائش موجود ہے۔ ان میں سے کسی ایک رائے کو ترجیح بھی دی جاسکتی ہے اور ان سب کو سامنے رکھ کر اس مسئلہ پر مزید غور وفکر بھی ہوسکتا ہے۔

ایک قابلِ غور رائے

اس مسئلے میں ایک اور رائے بھی ہمیں ملتی ہے۔ یہ رائے اصم اور مفسر ابن عطیہ کی ہے۔وہ کہتے ہیں کہ عورت اور مرد دونوں کی دیت ایک ہے۔ اصم کا استدلال قرآن مجید کی اس آیت سے ہے۔

وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَأً فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُؤْمِنَةٍ وَّدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖٓ (النساء:۹۲)	جو شخص کسی مسلمان کو غلطی سے قتل کردے وہ ایک مسلمان غلام کو آزاد کرے اور اس کے گھر والوں کو دیت پہنچائے۔

اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ اس آیت میں مسلمان مرد اور عورت دونوں کے قتل کا حکم بیان ہوا ہے۔ ان کی دیت بھی اس آیت کی رو سے ایک ہی ہونی چاہیے[1]

علامہ رشید رضا مصری کہتے ہیں کہ قرآن مجید نے مذکورہ بالا آیت میں، بغیر کسی قید کے دیت کا مطلق ذکر کیا ہے۔ لفظ کے اندر عموم پایا جاتا ہے۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ دیت کی جس مقدار پر بھی مقتول کے ورثاء راضی ہو جائیں وہ درست ہوگی، چاہے وہ کم ہو یا زیادہ، لیکن سنت نے اس کی تحدید کردی ہے۔ اس میں اس رواج کو سامنے رکھا گیا ہے جو عرب میں معروف اور مقبول تھا۔ فقہاء کا اس پر اتفاق ہے کہ ایک آزاد مسلمان کی، جس نے کوئی ایسا جرم نہ کیا ہو جس سے اس کا خون مباح ہو جائے، دیت

---

[1] تفسیر کبیر: ۳/ ۲۹۷

سو اونٹ یا اس کی قیمت ہے اور عورت کی دیت اس کے نصف ہے۔ اس کے بعد فرماتے ہیں۔

ظاهر الأية انه لا فرق بين الذكر والانثى[1]	آیت سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ مرد اور عورت کی دیت میں کوئی فرق نہیں ہے۔

اس میں شک نہیں کہ معروف فقہاء نے اس رائے کو اختیار نہیں کیا ہے کہ عورت اور مرد دونوں کی دیت ایک ہے، اس لیے یہ ایک شاذ رائے معلوم ہوتی ہے۔ لیکن بہرحال قابلِ غور ہے اور اس پر ضرور غور ہونا چاہیے۔

---

[1] تفسیر المنار: ۵/۳۳۲،۳۳۳

عورت کی شہادت

اسلام کے قانونِ شہادت پر ایک اعتراض یہ ہے کہ اس میں دو عورتوں کی شہادت ایک مرد کی شہادت کے برابر ہے۔ یہ عورت کی توہین اور اس کے ساتھ غیر مساوی رویہ ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اسلام نے بہت سے معاملات میں عورت اور مرد کی شہادت میں فرق کیا ہے، لیکن اسے عورت کی توہین سمجھنا سراسر زیادتی اور اسلام کی تعلیمات کے خلاف ہے۔ یہ فرق اسلام نے زبردستی نہیں پیدا کیا ہے، بلکہ اس کے اسباب خود عورت کی فطرت، اس کے مزاج اور اس کے دائرۂ عمل کے اندر موجود ہیں۔ اس مسئلہ میں اسلام کے نقطۂ نظر کو کسی قدر تفصیل سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔

اسلام نے شہادت کی تین قسمیں قرار دی ہیں۔

حدود و قصاص میں شہادت

کسی شخص پر حد کے نفاذ یا اس سے قصاص لینے کے لیے دو مردوں کی گواہی ضروری ہے۔ البتہ زنا کے ثبوت کے لیے چار مردوں کی شہادت لازمی ہے۔ اس کے بغیر زنا کا الزام ثابت نہ ہوگا اور حد جاری نہیں ہوگی۔ قرآن مجید نے زنا کے ثبوت کے لیے نصاب شہادت کا ذکر ان آیات میں کیا ہے۔

وَالّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَۃَ مِنْ نِّسَآئِکُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَیْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْکُمْ ج (النساء:۱۵)	تمہاری عورتوں میں سے جو زنا کا ارتکاب کریں ان پر اپنوں میں سے چار مردوں کو گواہ ٹھہراؤ۔

دوسری جگہ فرمایا:

وَالَّذِیْنَ یَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ یَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِیْنَ جَلْدَةً (النور:۴)	جو لوگ پاک دامن عورتوں پر زنا کی تہمت لگائیں اور اس پر چار مرد گواہ نہ پیش کریں ان کو اَسّی (۸۰) کوڑے مارو۔

ان آیات میں اربعة منکم (تم میں کے چار مرد) اربعة شہداء (چار مرد گواہ) کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ زنا کے ثبوت کے لیے چار مردوں کی شہادت ضروری ہے[1]

اس کے معنی یہ ہیں کہ حدود و قصاص میں صرف مردوں کی شہادت معتبر ہوگی عورتوں کی شہادت قبول نہیں کی جائے گی۔ مشہور تابعی امام زہری کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلعم اور حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے دور میں اسی اصول پر عمل ہوتا تھا فرماتے ہیں۔

مضت السنة من لدن النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم و الخلیفتین من بعدہٖ ان لا شہادة للنساء فی الحدود و القصاص[2]	نبی ﷺ اور آپ کے بعد کے دونوں خلفاء (شیخینؓ) کے عہد سے یہ سنت رہی ہے کہ حدود و قصاص میں عورتوں کی شہادت قابل قبول نہیں۔

اسلام نے انسان کی جان، مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کے لیے حدود و

---

[1] یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ یہ کہ جب قتل جیسے جرم کے ثبوت کے لیے دو مردوں کی شہادت کافی ہے تو آخر زنا ہی کے ثبوت کے لیے چار مردوں کی شہادت کو کیوں ضروری قرار دیا گیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اسلام اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ سوسائٹی میں اس بے حیائی کا ذکر اور چرچا ہو۔ اگر کسی سے یہ جرم سرزد ہو بھی جائے تو اس پر پردہ ڈال دیا جائے۔ زنا کی سزا اس وقت دی جائے جب کہ چار عینی شاہد اس کی گواہی دی۔

[2] ابن حجر، الدرایۃ فی تخریج احادیث الہدایہ: ص۲۹۵

قصاص رکھے ہیں۔ کوئی کسی کو قتل کر بیٹھے تو قصاص میں اس کی جان لی جاتی ہے۔ بے شادی شدہ شخص زنا کا ارتکاب کرے تو اسے سو کوڑے لگائے جاتے ہیں۔ یہی جرم شادی شدہ سے ہو تو اسے سنگ سار کیا جاتا ہے۔ چوری ثابت ہو جائے تو چور کا ہاتھ کاٹ دیا جاتا ہے۔ تہمت تراشی اور شراب نوشی پر بھی سخت سزائیں رکھی گئی ہیں۔ جن جرائم پر اسلام نے حدود رکھے ہیں یا قصاص کا حکم دیا ہے وہ اتنی سنگین نوعیت کے ہیں کہ ان کے ارتکاب کے بعد آدمی زندہ بھی رہے تو سوسائٹی میں اس کا وقار بری طرح مجروح ہو جاتا ہے اور اس کی عزت اور احترام باقی نہیں رہتا۔ ان جرائم کے ثبوت کے لیے عورتوں کی شہادت قبول نہ کیے جانے کی وجہ بظاہر ان کی یہی مخصوص نوعیت اور اہمیت ہے۔ عورت اصلاً گھر کی منتظمہ ہے اس کا ایک اپنا ذہن و مزاج ہے اور ایک خاص ماحول میں اس کی نشو ونما اور تربیت ہوتی ہے۔ اسے اُن حالات اور اسباب سے کم ہی سابقہ پیش آتا ہے جن میں یہ بھیانک جرائم سرزد ہوتے ہیں۔ اس لیے ان کے بارے میں اس کا علم اور مشاہدہ اتنا مکمل نہیں ہو سکتا جتنا مرد کا ہوتا ہے۔ پھر یہ کہ عورت کے لیے اپنے مزاج کی نرمی اور احساس کی شدت کی وجہ سے انفرادی اور اجتماعی قتل، چوری، ڈکیتی اور عصمت دری جیسے بھیانک جرائم کا اپنی تمام تفصیلات کے ساتھ مشاہدہ کرنا، انھیں پوری طرح محفوظ رکھنا اور ٹھیک ٹھیک بے کم و کاست عدالت کے سامنے پیش کرنا آسان نہیں ہے۔ ان معاملات میں اس کے بیانات سے عدالت کو وہ یقین نہیں حاصل ہو سکتا جو مرد کے بیانات سے ہوتا ہے۔ اس میں شک و شبہ کا پہلو غالب رہے گا۔ اسلام کا حکم ہے کہ بغیر مضبوط ثبوت کے حدود پر عمل نہ کیا جائے اور ملزم کو جہاں تک ہو سکے بچانے کی کوئی صورت نکالی جائے۔ رسول اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

ادرء وا الحدود عن المسلمین ما استطعتم[1]	جہاں تک ہو سکے مسلمانوں سے حدود کو دفع کرو۔

---

[1] ترمذی، ابواب الحدود، باب ماجاء فی درء الحدود۔ یہ روایت مرفوع اور موقوف دونوں طرح سے آئی ہے۔ امام ترمذی فرماتے ہیں کہ صحیح یہ ہے کہ یہ موقوف ہے۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ جہاں شبہ موجود ہو حدود پر عمل نہ کیا جائے۔

ادرء وا الحدود بالشبهات[1] شبہات کی موجودگی میں حدود کو ٹال دو

بعض عورتیں ایسی ہو سکتی ہیں جن کا مشاہدہ قتل، چوری، ڈکیتی اور عصمت دری کی بھیانک شکلوں میں بھی قابلِ اعتماد قرار دیا جا سکتا ہے اور وہ انھیں عدالت کے سامنے ٹھیک طریقے سے پیش بھی کر سکتی ہیں لیکن بہ حیثیت ایک نوع کے عورت کا مزاج اس کا متحمل نہیں ہے۔ ظاہر ہے فیصلہ جب کسی نوع کے بارے میں کیا جائے گا تو اس کے چند افراد کو نہیں بلکہ اس کی بڑی اکثریت کو سامنے رکھا جائے گا۔

حقوق و معاملات میں شہادت

حدود و قصاص کے علاوہ دوسرے حقوق اور معاملات میں عورت کی شہادت قبول کی جائے گی۔ اس کی وجہ ایک تو یہ ہے کہ حدود و قصاص کی جو اہمیت ہے دوسرے معاملات کی نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ ان کا تعلق روز مرہ کے مسائل سے ہے۔ عورت کا دائرۂ عمل گھر ہونے کے باوجود ان معاملات سے اسے برابر سابقہ پیش آتا رہتا ہے۔ البتہ اس کے مخصوص حالات اور اس کی بعض طبعی کمزوریوں کی وجہ سے دو اقدامات کیے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ کسی معاملہ کا فیصلہ صرف عورتوں کی شہادت پر نہ کیا جائے، بلکہ اس وقت کیا جائے جب کہ یا تو اس کے حق میں دو مردوں کی شہادت ہو یا کم از کم ایک مرد اور دو عورتیں گواہی دیں۔ ایک مرد کی جگہ دو عورتیں رکھنے کی وجہ قرآن نے یہ بیان کی ہے کہ کسی واقعہ کی تفصیلات عورت بھول سکتی ہے۔ ایک عورت سے بھول ہو جائے تو دوسری اسے یاد دلا دے گی۔ ارشاد ہے۔

وَاسۡتَشۡهِدُوۡا شَهِيۡدَيۡنِ مِنۡ رِّجَالِكُمۡ ۚ فَاِنۡ لَّمۡ يَكُوۡنَا رَجُلَيۡنِ فَرَجُلٌ وَّامۡرَاَتٰنِ

اپنے مردوں میں سے دو گواہ کرلو، اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں ہوں

---

[1] یہ حدیث سنداً کمزور ہے لیکن کئی سندوں سے مروی ہے اس لیے قابلِ احتجاج ہے۔ نیل الاوطار: ۲۷۲/۷

مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰهُمَا الْاُخْرٰى ؕ (البقرہ:۲۸۲)

ان لوگوں میں سے جن کو تم گواہ بنانا پسند کرو تا کہ ایک ان میں سے بھول جائے تو دوسری اسے یاد دلا دے۔

آیت سے بظاہر یہ شبہ ہوتا ہے کہ عورتوں کی گواہی اسی وقت قبول کی جائے گی جب کہ مرد موجود نہ ہوں، لیکن یہ شبہ صحیح نہیں ہے۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ شہادت میں یا تو دو مرد ہوں یا ایک مرد اور دو عورتیں۔ جن معاملات میں عورت کو حقِ شہادت حاصل ہے ان میں مردوں کے ہوتے ہوئے بھی ایک مرد اور دو عورتوں کی شہادت قبول کی جائے گی۔

آیت سے یہ استدلال بھی کیا گیا ہے کہ عورتوں سے الگ الگ شہادت نہیں لی جائے گی بلکہ شہادت کے وقت دونوں ایک ساتھ ہوں گی تا کہ جن باتوں کو ایک بھول رہی ہو اسے دوسری یاد دلا دے۔[1]

آیتِ زیرِ بحث قرض کے احکام کے ذیل میں آئی ہے۔ اس لیے جمہور ائمہ کا اس پر اتفاق ہے کہ قرض کے لین دین اور مالی معاملات میں عورت کی شہادت قبول کی جائے گی۔[2]

احناف کے نزدیک ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی صرف حدود و قصاص میں قبول نہیں کی جائے گی۔ اس کے سوا تجارت، قرض، مالی لین دین، عاریت، اجارہ، کفالت، نکاح، وکالت، طلاق، وصیت، وراثت وغیرہ تمام حقوق و معاملات میں ان کی شہادت قابلِ قبول ہوگی۔

اس کی دلیل یہ دی گئی ہے کہ شہادت کے لیے تین باتیں ضروری ہیں۔ ایک یہ کہ واقعہ کا ٹھیک ٹھیک مشاہدہ ہو۔ دوسرے یہ کہ اسے پوری طرح یاد رکھا جائے۔

---

۱ فتح الباری: ۱۶۹/۵

۲ ایضاً ۱۶۸/۵

تیسرے یہ کہ اسے من وعن بیان کیا جائے۔ عورت کی کم زوری قرآن نے یہ بیان کی ہے کہ وہ تفصیلات کو بھول سکتی ہے اس کی تلافی ایک مرد کی جگہ دو عورتیں رکھ کر کردی گئی۔ لہٰذا حدود و قصاص کے علاوہ اور معاملات میں اس کی شہادت قبول کی جانی چاہیے۔

یہاں ایک سوال کیا جاسکتا ہے وہ یہ کہ دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کی گواہی کے برابر ہے تو جن معاملات کا فیصلہ دو مردوں کی شہادت پر ہوتا ہے ان کا فیصلہ چار عورتوں کی شہادت پر بھی ہونا چاہیے۔ اس کا جواب فقہاء نے یہ دیا ہے کہ عقلاً یہ بات صحیح ہے لیکن اگر اسے جائز قرار دے دیا جائے تو عورتوں کی گھر سے باہر آمد و رفت بہت بڑھ جائے گی۔ شریعت کا مقصد یہ ہے کہ وہ گھر سے باہر زیادہ نہ نکلیں[1] اس لیے کہ اس سے جو مفاسد پیدا ہوتے ہیں وہ بڑے ہی خطرناک ہیں (آج اس کا تجربہ ہم سب کے سامنے ہے۔)

عورتوں کے مخصوص مسائل میں شہادت

اس بات پر فقہاء کا اتفاق ہے کہ جو معاملات عورتوں کے ساتھ مخصوص ہیں ان میں عورتوں کی شہادت کافی ہے۔ جیسے ولادت کے وقت بچہ کی زندگی کی شہادت۔ اس لیے کہ بچہ زندہ پیدا ہو تو اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی اور اس سے متعلق احکامِ وراثت پر عمل ہوگا ورنہ نہیں۔ یا اس امر کی شہادت کہ کوئی عورت بالغ ہے یا نابالغ، باکرہ ہے یا نہیں۔ یا عورتوں کے مخصوص جنسی عیوب اور امراض کی شہادت۔ ان سب باتوں کا بعض اوقات نکاح اور اس سے متعلقہ مسائل پر اثر پڑتا ہے[2]

اس مسئلہ میں امام زہری کا بیان ہے۔

مضت السنة ان تجوز شهادة النساء فى مالا يطلع عليه غيرهن	سنت یہ رہی ہے کہ (صرف) عورتوں کی شہادت ان معاملات میں جائز ہے جن سے ان کے علاوہ

---

[1] ہدایہ ۱۵۴/۳ مع شروح ہدایہ

[2] بعض تفصیلات میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے۔ یہاں اس سے بحث نہیں کی گئی ہے۔

من ولادات النساء و عیوبھن دوسرا واقف نہیں ہوتا۔ یعنی عورتوں کے بچہ جننے کے وقت اس کی حالت یا ان کے عیوب۔

حضرت عبد اللہ بن عمرؓ حضرت سعید بن المسیبؒ حضرت عروہ بن زبیرؓ کے اقوال اس کی تائید میں ملتے ہیں۔ حضرت علیؓ کے بارے میں آتا ہے کہ انھوں نے ایک دایہ کی گواہی پر فیصلہ کیا۔ حضرت عمرؓ نے بھی ایک دایہ کی شہادت کو تسلیم کیا کہ بچہ زندہ پیدا ہوا تھا[1]

فقہاء کے درمیان اس میں اختلاف ہے کہ عورتوں کے مخصوص مسائل میں کتنی عورتوں کی شہادت ضروری ہے۔ عام طور پر اس کے لیے چار عورتوں کا نصاب رکھا گیا ہے۔ امام مالک اور ابن ابی لیلیٰ کہتے ہیں کہ اس میں دو عورتوں کی شہادت پر فیصلہ ہوگا۔ امام ثوری اور احناف کے نزدیک ایک عورت کی شہادت بھی کافی ہے[2]

احناف نے اس کی دو دلیلیں دی ہیں ایک یہ کہ اوپر کی روایت میں تعداد کی کوئی شرط نہیں رکھی گئی ہے اس لیے ایک عورت کی شہادت بھی کافی ہونی چاہیے۔ دوسری دلیل یہ کہ عورتوں کے مخصوص مسائل میں صرف انھیں کی شہادت کو اس کے لیے کافی سمجھا گیا اور مرد کی شہادت ضروری نہیں قرار دی گئی کہ کسی عورت کے پوشیدہ مقامات کو دوسری عورت کے دیکھنے میں جتنی قباحت ہے اس سے زیادہ قباحت اس میں ہے کہ کوئی مرد انھیں دیکھے اس بنیاد پر کہا جاسکتا ہے کہ ایک عورت کے مقابلے میں زیادہ عورتوں کے معائنہ کرنے میں قباحت بھی زیادہ ہے۔ لیکن اس کے ساتھ احتیاط اسی میں بتائی گئی ہے کہ ایک سے زیادہ عورتوں کی شہادت ہو[3]

۱۔ الدرایہ فی تخریج احادیث الہدایہ: ص۲۹۵

۲۔ فتح الباری: ۵/۱۶۸، ۱۶۹

۳۔ ہدایہ: ۳/۱۵۴۔ عورت کی شہادت کے موضوع پر اسلام کے نقطۂ نظر کو تفصیل سے سمجھنے کے لیے ملاحظہ ہو۔ راقم کی کتاب 'عورت-اسلامی معاشرہ میں'

عورت اور سیاسی قیادت

عورت اسلامی ریاست کی سربراہ نہیں ہوسکتی

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

لن یفلح قوم ولّوا امرھم امرأۃ[1]

وہ قوم ہرگز کامیاب نہیں ہوسکتی جس نے اپنے معاملات کسی عورت کے سپرد کردیے۔

اس سے یہ استدلال کیا گیا ہے اور یہ استدلال بالکل صحیح ہے کہ عورت اسلامی ریاست کی سربراہ نہیں ہوسکتی اس لیے کہ جو اقدام کسی قوم کے لیے موجب فلاح نہ ہو اور اسے تباہی وخسران کی طرف لے جانے والا ہو، اس سے اس کا احتراز کرنا ضروری ہے۔

نماز کی امامت سے استدلال

اس کی تائید ایک اور پہلو سے بھی ہوتی ہے وہ یہ کہ امامت کبریٰ کو امامت صغریٰ یعنی نماز کی امامت پر قیاس کیا گیا ہے۔ چناں چہ رسول اللہ ﷺ نے مرض الموت میں نماز کی امامت کے لیے صحابۂ کرامؓ کے درمیان میں سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو آگے بڑھایا تھا تو اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ آپ امامتِ کبریٰ کے بھی سب سے زیادہ اہل ہیں۔ بعد میں اس پر اجماع ہوگیا۔

---

[1] بخاری، کتاب المغازی، باب کتاب النبیؐ الی کسریٰ وقیصر۔ ترمذی، ابواب الفتن۔

جمہور امت کا اس پر اتفاق ہے کہ عورت نماز میں مردوں کی امامت نہیں کرسکتی[1] اس کا مطلب یہ ہے کہ امامتِ کبریٰ کے لیے وہ بدرجہ اولیٰ موزوں نہیں ہے۔

کیا یہ عورت کے ساتھ تعصب ہے؟

اس پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس میں عورت کے ساتھ تعصب برتا گیا ہے اور اسے ایک طرح سے اجتماعی زندگی سے بے دخل کر دیا گیا ہے۔

اسلام میں سربراہِ مملکت کی ذِمہ داریاں

یہاں یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ اسلام میں مملکت کے سربراہ کی حیثیت تاجِ برطانیہ کی طرح محض قانونی سربراہ کی نہیں ہے، بلکہ وہی اصلاً ملکی معاملات میں مسئول اور ذمہ دار ہوتا ہے۔ صحیح حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

امام الذی علی الناس راع وھو مسئول عن رعیتہٖ[2]	امام جو لوگوں کا سربراہ ہے، وہ راعی اور نگراں ہے۔ اس سے اس کی رعیت کے بارے میں پوچھا جائے گا۔

ہمارے علماء نے لکھا ہے کہ اسلامی مملکت کے لیے سربراہ کا ہونا اس لیے ضروری ہے تاکہ وہ احکامِ شریعت نافذ کرے، اللہ کے حدود قائم کرے، دشمنوں سے ملک کی حفاظت کرے، مالِ غنیمت صحیح طریقے سے تقسیم کرے، مالیات کا نظم کرے۔ بغاوت اور بدامنی کو روکے، ہر حال میں عدل و انصاف قائم کرے، غریبوں اور لاوارثوں کے مسائل حل کرے وغیرہ۔

---

[1] امام شافعی کے نزدیک اگر جماعت صرف عورتوں کی ہو تو عورت ان کی امامت کرسکتی ہے۔ ابو ثور اور طبری نے عورت کی امامت کو مطلقاً جائز قرار دیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ مردوں کی امامت بھی کرسکتی ہے۔ لیکن جیسا کہ ابن رشد نے لکھا ہے یہ ایک شاذ رائے ہے۔ بدایۃ المجتہد: ۱/ ۱۴۸-۱۴۹

[2] بخاری، کتاب الاعتصام، باب قول اللہ و اطیعوا... الخ

اتنی بھاری ذمہ داریوں کو اٹھانے کے لیے وہ کہتے ہیں کہ سربراہِ مملکت ایسے شخص کو ہونا چاہیے جو انتہائی باہوش اور صاحب تدبیر ہو، بڑی عقل وفراست رکھتا ہو، رعب اور دبدبے والا ہو، مضبوط اعصاب اور قوتِ ارادی کا مالک ہو، علم، تقویٰ اور انتظامی صلاحیت اور شجاعت اس کے اندر ہو۔ تجربہ بتاتا ہے کہ بیک وقت یہ ساری خصوصیات مرد میں بھی کم ہی پائی جاتی ہیں، عورت میں تو ان کا پایا جانا اور بھی دشوار ہے۔

سربراہِ مملکت یا امام کے لیے یہ بھی ضروری قرار دیا گیا ہے کہ وہ عوامی زندگی گزارے، جمعہ اور عیدین کی نماز پڑھائے اور حج کا امیر ہو۔ ان تمام باتوں کا مقصد یہ ہے کہ عام لوگوں سے اس کا ربط ضبط رہے، وہ آسانی سے اس سے مل سکیں اور وہ خود بھی ان کے حالات سے براہِ راست واقف ہو سکے[1]

عورت یہ ذمہ داریاں نہیں اُٹھا سکتی

عورت کے لیے اسلامی حدودِ معاشرت کی پابندی کرتے ہوئے اس طرح کی پبلک لائف یا عوامی زندگی گزارنا ممکن نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عورت اپنی قوت و صلاحیت، مصروفیات، اندازِ فکر، رجحان اور جذبات و احساسات کسی بھی پہلو سے سربراہ ریاست کے بوجھ کی متحمل نہیں ہوسکتی۔

کیا عورت دوسری اِجتماعی ذمہ داریوں کی اہل ہے؟

یہاں یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ اس بحث کا تعلق حکومت کی سربراہی یا امامتِ کبریٰ سے ہے۔ اس سے کم تر درجہ کی اجتماعی ذمہ داریاں اسے سونپی جاسکتی ہیں یا نہیں؟ اس میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے۔ فقہ حنفی کی رو سے حدود و قصاص کے علاوہ دیگر معاملات میں اسے قاضی بنایا جاسکتا ہے۔ چناں چہ ہدایہ میں ہے:

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھی جائے۔ شرح عقائد نسفی ص ۱۱۳، ۱۱۴

یجوز قضاء المرأة فی کل شیء الا فی الحدود والقصاص[۱]	حدود و قصاص کے علاوہ دیگر معاملات میں فیصلہ کرنا عورت کے لیے جائز ہے۔

اسی طرح اسے اوقاف کی نگراں اور یتیموں کی سرپرست بھی بنایا جاسکتا ہے[۲]

ان تفصیلات پر جو شخص بھی سنجیدگی سے غور کرے گا اسے اعتراف کرنا پڑے گا کہ اسلام نے عورت کے ساتھ نہ تو تعصب برتا ہے اور نہ کسی قسم کی زیادتی کی ہے بلکہ اس پر وہی ذمہ داریاں ڈالی ہیں جن کو وہ آسانی سے اٹھا سکتی ہے۔ جو ذمہ داریاں اس کی طاقت سے باہر ہیں ان سے اسے سبک دوش کردیا ہے۔ یہ نا انصافی نہیں عین انصاف ہے[۳]

○♦○

---

۱ ہدایہ: ۱۴۰/۳

۲ درالمختار مع ردالمحتار: ۴۹۴/۴

۳ مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو راقم کی کتاب 'عورت - اسلامی معاشرہ میں'

کتابیات

کتاب میں جہاں قرآن مجید کی آیات آئی ہیں ان کے نیچے سورتوں کے نام اور آیات کے نمبر دے دیے گئے ہیں۔ قرآن مجید کے علاوہ جن کتبِ مآخذ سے استفادہ کیا گیا ہے ان کے حوالے حواشی میں ہیں۔ وہاں طوالت سے بچنے کے لیے کتاب کے مختصر نام، اس کی جلد اور صفحات کے حوالے پر اکتفا کیا گیا ہے۔ کہیں کہیں کتاب کے ساتھ اس کے مصنف کا بھی ذکر ہے۔ یہاں موضوع کے لحاظ سے کتاب اور مصنف کا پورا نام، اس کا سن وفات، کتاب کے پیش نظر نسخے کے مطبع اور سن طباعت کی تفصیل دی جا رہی ہے تاکہ مراجعت میں آسانی ہو۔

نظر ثانی کے دوران میں بعض کتابوں کے نئے ایڈیشن سامنے تھے، ان کے حوالے موقع پر حواشی میں تفصیل سے دے دیے گئے ہیں۔ حدیث کی جن کتابوں کے حوالے کتب و ابواب کی صراحت کے ساتھ دیے گئے ہیں ان کے مطابع وغیرہ کے ذکر کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔

تفسیر

۱- ابن جریر (جامع البیان فی تفسیر القرآن) ابوجعفر محمد بن جریر الطبری، م ۳۱۰ھ المطبعۃ المیمنیہ۔ مصر ۱۳۲۱ھ

۲- ابن کثیر (تفسیر القرآن العظیم) عماد الدین اسماعیل م ۷۷۴ھ مطبعہ مصطفیٰ محمد مصر ۱۳۵۶ھ

۳- احکام القرآن۔ ابو بکر احمد بن علی الرازی الجصاص الحنفی م ۳۷۰ھ۔ مطبعہ البہیہ، مصر ۱۳۴۷ھ

۴- احکام القرآن۔ ابن العربی المالکی م ۵۴۲ھ۔ مطبعۃ السعادۃ، مصر ۱۳۳۱ھ

۵- بیضاوی (انوار التنزیل و اسرار التاویل) القاضی ناصر الدین البیضاوی م ۶۸۵ھ مطبع احمد دہلی ۱۲۶۸ھ

۶- تفسیرات احمدیہ فی بیان الآیات الشرعیۃ مع تفریعات المسائل الفقہیہ۔ الشیخ احمد المدعو بملا جیون

م۱۷۱۷ء-مطبع جید برقی پریس دہلی ۱۳۴۹ھ

۷- تفسیر کبیر (مفاتیح الغیب) فخر الدین محمد بن عمر الرازی م۶۸۴ھ
المطبعہ العامرہ الشرفیہ مصر ۱۳۰۸ھ

۸- السراج المنیر فی الاعانۃ علی معرفۃ بعض معانی کلام ربنا الحکیم الخبیر۔ محمد الشربینی الخطیب
م ۹۷۷ھ۔ مطبع منشی نول کشور۔ لکھنؤ

۹- الکشاف عن حقائق التنزیل وعیون الاقاویل فی وجوہ التاویل۔ ابو القاسم جار اللہ محمود بن عمر
الزمخشری م۵۳۸ھ مطبعہ اللیثی کلکتہ ۱۲۷۶ھ

۱۰- معالم التنزیل ابو محمد الحسین بن مسعود الفراء البغوی م۵۱۶ھ۔ تفسیر خازن کے ساتھ چھپی ہے۔
مطبعہ التقدم العلمیہ۔ مصر ۱۳۴۹ھ

۱۱- المنار (تفسیر القرآن الحکیم) السید محمد رشید رضا م۱۹۳۵ء مطبعہ المنار۔ مصر ۱۳۶۵ھ

حدیث

۱۲- التلخیص الحبیر فی تخریج احادیث الرافعی الکبیر۔ شہاب الدین احمد بن علی بن حجر العسقلانی
م۸۵۲ھ مطبع انصاری دہلی۔ ۱۳۰۷ھ

۱۳- جامع ترمذی- ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ الترمذی م۲۷۹ھ

۱۴- الجوہر النقی علی السنن الکبریٰ للبیہقی علاء الدین بن علی بن عثمان الماردینی الشہیر بابن الترکمانی
م۷۴۵ھ السنن الکبریٰ، بیہقی (نمبر ۲۰) کے ساتھ چھپی ہے۔

۱۵- الدرایہ فی تخریج احادیث الہدایہ- شہاب الدین احمد بن علی بن حجر العسقلانی۔ م۸۵۲ھ محبوب
المطابع ۱۳۵۰ھ

۱۶- سنن نسائی۔ ابوعبد الرحمٰن احمد بن شعیب بن علی النسائی م۳۰۳ھ

۱۷- سنن ابن ماجہ۔ ابوعبد اللہ محمد بن یزید بن عبد اللہ بن ماجہ القزوینی م۲۷۳ھ

۱۸- سنن دارمی۔ ابوعبد اللہ الدارمی م۲۵۵ھ

۱۹- سنن دارقطنی۔ علی بن عمر الدارقطنی م۳۸۵ھ۔ مطبع فاروقی دہلی۔ ۱۳۱۰ھ

۲۰- سنن بیہقی (السنن الکبریٰ) ابو بکر احمد بن الحسین بن علی البیہقی م ۴۵۸ھ۔ دائرۃ المعارف
حیدر آباد، دکن ۱۳۵۵ھ

۲۱- سنن ابی داؤد، ابو داؤد سلیمان بن اشعث السجستانی م۲۷۹ھ

۲۲- صحیح بخاری (الجامع الصحیح)۔ محمد بن اسماعیل البخاری م ۲۵۶ھ
۲۳- صحیح مسلم، ابوالحسین مسلم بن الحجاج م ۲۶۱ھ
۲۴- مؤطا امام مالک، مالک بن انس بن مالک م ۱۷۹ھ
۲۵- مسند احمد، احمد بن حنبل الشیبانی م ۲۴۱ھ المطبعۃ المیمنیہ مصر ۱۳۱۳ھ
۲۶- مشکوٰۃ المصابیح، ولی الدین محمد بن عبداللہ الخطیب التبریزی م ۷۳۷ھ یا اس کے بعد

شروح حدیث

۲۷- تحفۃ الاحوذی، مولانا عبد الرحمٰن بن عبد الرحیم المبارکفوری ۱۳۵۳ھ۔ مطبع جید برقی پریس دہلی۔ ۱۳۴۶ھ
۲۸- التعلیق المغنی علی سنن دارقطنی، مولانا شمس الحق عظیم آبادی م ۱۳۲۹ھ دارقطنی کے ساتھ چھپی ہے۔ مطبع فاروقی دہلی
۲۹- التیسیر بشرح الجامع الصغیر علامہ محمد عبدالرؤف المناوی م ۱۰۳۱ھ دار المطبعۃ العامرہ مصر ۱۲۸۲ھ
۳۰- حاشیہ السندی علی النسائی۔ علامہ ابوالحسن محمد بن عبد الہادی م ۱۱۳۸ھ۔ نسائی مطبوعہ مجتبائی دہلی کے حاشیہ پر چھپا ہے۔
۳۱- شرح الزرقانی علی المؤطا۔ محمد بن عبد الباقی بن یوسف بن احمد شہاب الدین الزرقانی م ۱۱۸۷ھ۔ مطبعہ خیریہ مصر ۱۳۰۱ھ۔
۳۲- شرح معانی الآثار۔ احمد بن سلیمان الازدی الطحاوی م ۳۲۱ھ
۳۳- شرح صحیح مسلم، محی الدین ابوزکریا یحیٰی النووی م ۶۷۶ھ اصح المطابع ۱۳۴۹ھ
۳۴- فتح الباری، شہاب الدین ابوالفضل احمد بن علی بن حجر م ۸۵۲ھ المطبعہ الخیریہ مصر ۱۳۲۹ھ
۳۵- فیض الباری علی صحیح البخاری، علامہ انور شاہ کشمیری م ۱۳۵۲ھ۔ مطبع حجازی قاہرہ ۱۳۵۷ھ
۳۶- معالم السنن، ابوسلیمان احمد بن محمد الخطابی م ۳۸۸ھ۔ مطبعہ العلمیہ حلب ۱۳۵۱ھ

فقہ و فتاویٰ

۳۷- الافصاح عن معانی الصحاح۔ الوزیر عون الدین ابوالمظفر یحیٰی بن محمد بن ہبیرہ الحنبلی م ۵۶۰ھ مطابع الرجبی القاہرہ۔
۳۸- اعلام الموقعین عن رب العلمین۔ شمس الدین ابوعبداللہ محمد بن ابوبکر المعروف بابن قیم الجوزیہ م ۷۵۱ھ ادارۃ الطباعۃ المنیریہ مصر۔

۳۹- بدایۃ المجتہد ونہایۃ المقتصد۔ القاضی ابوالولید محمد بن احمد ابن رشد القرطبی م۵۹۵ھ، مصر ۱۹۶۶ھ
۴۰- حاشیہ الصاوی علی الشرح الصغیر، احمد بن محمد الصاوی م ۱۲۴۱ھ۔ الشرح الصغیر (نمبر۴۳) کے حاشیہ پر چھپی ہے۔
۴۱- الدر المختار شرح تنویر الابصار، محمد علاء الدین الحنفی م۱۰۸۸ھ رد المختار (نمبر۴۲) کے حاشیہ پر چھپی ہے۔
۴۲- رد المختار علی الدر المختار، محمد امین ابن عابدین م ۱۸۳۶ء مطبع عثمانیہ مصر ۱۳۲۷ھ
۴۳- الشرح الصغیر علی اقرب المسالک الی مذہب الامام مالک۔ علامہ احمد بن محمد الدردیر م۱۷۸۶ء دار المعارف مصر ۱۳۹۲ھ
۴۴- شرح الوقایہ مع حاشیتہ عمدۃ الرعایہ۔ عبید اللہ بن مسعود بن تاج الشریعہ م۷۴۷ھ، مطبع قیومی، کانپور۔ ۱۹۱۶ء
۴۵- العنایہ (شرح الہدایہ) اکمل الدین محمد بن محمود البابرتی م۱۳۸۴ء فتح القدیر (نمبر۴۶) کے حاشیہ پر چھپی ہے۔
۴۶- فتح القدیر للعاجز الفقیر (شرح الہدایہ) کمال الدین محمد بن عبد الواحد المعروف بابن الہمام الحنفی، م۶۸۱ھ المطبعہ الکبریٰ الامیریہ مصر ۱۳۱۵ھ
۴۷- الکفایہ علی الہدایہ (شرح الہدایہ) جلال الدین الخوارزمی کلکتہ ۱۸۳۳ء
۴۸- المغنی علی مختصر ابی القاسم الخرقی، ابو محمد عبد اللہ بن احمد بن قدامہ المقدمی۔ م ۶۲۰ھ، مکتبہ الریاض الحدیثہ ۱۹۸۱ء
۴۹- مجموعہ فتاویٰ شیخ الاسلام احمد بن تیمیہ۔ جمع و ترتیب عبد الرحمٰن بن محمد بن قاسم۔ دار العربیہ لبنان۔ ۱۳۹۸ھ
۵۰- المحلی - ابو محمد علی بن احمد بن حزم م۴۵۶ھ ادارۃ الطباعۃ المنیریہ مصر ۱۳۵۲ھ
۵۱- الہدایہ (شرح بدایۃ المبتدی) برہان الدین علی بن ابی بکر المرغینانی م۵۹۳ھ، مطبع مجتبائی، دہلی ۱۹۳۱ء

عقائد

۵۲- شرح عقائد نسفی، سعد الدین التفتازانی م۷۹۲ھ رشیدیہ دہلی۔

لغت

۵۳- الدر النثیر علی ہامش النہایہ، جلال الدین عبدالرحمٰن بن ابو بکر السیوطی ۹۱۱ھ النہایہ (نمبر ۵۷) کے ساتھ چھپی ہے۔
۵۴- القاموس المحیط، مجد الدین محمد بن یعقوب الفیر وز آبادی م۸۱۷ھ مطبع نول کشور لکھنؤ
۵۵- لسان العرب ابو الفضل جمال الدین محمد بن مکرم ابن منظور المصری م۷۱۱ھ دار صادر۔ دار بیروت ۱۳۶۷ھ۔
۵۶- المفردات فی غریب القرآن، ابو القاسم الحسین بن محمد المعروف بالراغب الاصفہانی، م۵۰۲ھ المطبعۃ المیمنیہ مصر، ۱۳۲۴ھ
۵۷- النہایہ فی غریب الحدیث والاثر۔ ابن الاثیر الجزری م۶۰۶ھ المطبعۃ العثمانیہ مصر ۱۳۱۱ھ

اردو کتب و رسائل

۵۸- ماہنامہ 'برہان' دہلی
۵۹- سہ ماہی 'تحقیقات اسلامی' علی گڑھ
۶۰- ہفت روز دعوت 'مسلم پرسنل لاء نمبر' نئی دہلی
۶۱- ماہنامہ 'زندگی' رام پور
۶۲- 'عورت اسلامی معاشرہ میں' سید جلال الدین عمری، مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی
۶۳- 'عورت اور اسلام' سید جلال الدین عمری، مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی
۶۴- ماہنامہ 'الفرقان' لکھنؤ
۶۵- 'قومی آواز' نئی دہلی۔